ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

فروری ۲۰۱۹ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۸ | جمادی الاول والثانی ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdur Rehman Naeem, Mob. 9546692993; email-arehman412@yahoo.in

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	خوف خدا کی برکت	محمد عارف ندوی	
۲۔	تعزیت	سلسۃ الذہب کی ایک اور کڑی ٹوٹ گئی	مدیر	۳
۳۔	اداریہ	ہماری حالت زار اور ہمارا انتشار	مدیر	۵
۴۔	رپورٹ	رپورٹ جلسۂ تعزیت بروفات مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ	ادارہ	۸
۵۔	پیام سیرت	دل بدلتے دیر نہیں لگتی	محمد فرید حبیب ندوی	۱۰
۶۔	فقہیات	پیش آمدہ مسائل میں احوالِ زمانہ کی رعایت اور حدود	محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۱۳
۷۔	// //	اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل (آخری قسط)	محمد قمر الزماں ندوی	۲۰
۸۔	// //	مالی جرمانہ شریعت کی روشنی میں	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۲۴
۹۔	افکار و نظریات	جہاد اور اسلامی فتوحات-ایک فکری تجزیہ	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۳۱
۱۰۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۶
۱۱۔	سماجیات	گلوبلائزیشن کا فتنہ اور مسلم خاندانوں پر اس کا اثر	سید احمد ومیض ندوی	۴۳
۱۲۔	انکار حدیث	شریعت اسلامی میں حدیث کا مقام	محمد فرید حبیب ندوی	۴۸
۱۳۔	تجزیہ	مسلم دنیا پر مغربی استعمار اور اس کے نتائج	ذیشان سارہ	۵۵
۱۴۔	مطالعات	معارف الحدیث میں دعوتی پہلو	محمد شہاب علوی	۶۲

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

تعزیت

سلسۃ الذہب کی ایک اور کڑی ٹوٹ گئی

(حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کا سانحۂ ارتحال)

آج صبح فجر کی نماز پڑھ کر لوٹے، خبریں دیکھنے کے لئے موبائل اٹھایا تو سب سے پہلے جس خبر صاعقہ اثر نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (پیدائش: ۱۹۳۵ء- متوفی ۹ جمادی الاول ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶/ جنوری ۲۰۱۹ء) کے اس دنیا سے کوچ کر جانے کی خبر تھی، گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آفتاب علم وفضل آج صبح طلوع ہونے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا، مولانا واضح رشید حسنیؒ کا انتقال خانوادہ حسنی کے لیے یقیناً ایک بڑا حادثہ ہے، ملت کا بہت بڑا خسارہ ہے، فکر اسلامی کے قافلہ کی سالار قافلہ سے محرومی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا انتقال ندوۃ العلماء کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہے، مولانا کے انتقال سے اگر سب سے زیادہ خسارہ کسی کو ہوا ہے تو وہ ندوۃ العلماء کو ہوا ہے، ۱۹ جنوری ۲۰۱۹ کی یہ صبح کیسی صبح غم والم ثابت ہوئی جس نے اس چراغ کو ہی گل کر دیا جس کی زندگی دوسروں کو روشنی دینے کے لیے وقف تھی، کسی لکھنے والے نے برمحل لکھا ہے۔

سحر جو آئی تو لائی اس چراغ کی موت
تمام عمر جو جلتا رہا سحر کے لیے

مولانا واضح رشید صاحب کا شمار صف اول کے علماء میں ہوتا تھا، وہ ہندوستان میں اپنے علم وفضل، اپنے نقد ونظر، اپنی وسیع النظری اور فکری اعتدال نیز اپنے ادب وانشاء کے سبب منفرد شخصیت کے مالک تھے، ابھی چند ماہ قبل پروفیسر محسن عثمانی نے فکر اسلامی کے علمبرداروں کا اپنے ایک مضمون میں تذکرہ کیا تھا تو مولانا مرحوم کو بحیثیت مفکر ودانشور سرفہرست رکھا تھا، مگر افسوس کہ آج فکر کا یہ سوتا بھی خشک ہوگیا، علم وادب کا یہ آفتاب بھی غروب ہوگیا، جس سے نہ جانے کتنے ستاروں نے روشنی حاصل کی تھی، وہ سمندر بھی آج خاموش ہوگیا، جس سے نہ جانے کتنے دریا نکلتے تھے، اب کون مغرب کی سازشوں کا پردہ فاش کرے گا، کون عالم اسلام کی سیاست پر ناقدانہ تبصرہ کرے گا، مغربی مصادر پر کس کی نظر ہے مولانا کی طرح، کون اب "صور و اوضاع" کے کالم میں بصیرت کے موتی بکھیرے گا۔

مولانا مرحوم کی زندگی سادگی، تواضع، فنائیت اور نفس کشی سے عبارت تھی، وہ انتہائی خلیق وشفیق انسان تھے، وہ شفیق مربی، کامیاب معلم اور بالغ نظر عالم وناقد تھے، وماہر لسانیات تھے، عربی وانگریزی پر ان کو زبردست قدرت تھی، عربی زبان کی نزاکتوں کے محرم راز تھے، قدیم ندویوں سے ملیے تو وہ مولانا کی مدح میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، ہر ایک کی زبان پر یہی ہوتا ہے کہ ہمیں قلم پکڑنا مولانا نے سکھایا، مولانا کا انداز تربیت عجیب تھا، مولانا کی علمی مجلس سے کبھی سیری نہیں ہوتی تھی، مولانا کے

تربیت یافتہ قلم کاروں کی بڑی تعداد ہے، جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے، اس دور آخر میں عوارض اور ضعف کے باوجود بھی مولانا بولتے تھے تو علم وفضل کے موتی بکھیرتے جاتے تھے، گویا الفاظ ومعلومات کا سیل رواں ہوتا جو رکنے کا نام نہیں لیتا، مولانا بہت کم بولتے مگر جب بھی بولتے تو گھنٹوں کی تقریروں کو پانچ دس منٹ کے خطاب میں سمیٹ دیتے، یعنی دریا کوزے میں سمو دیتے، عربی زبان وادب حضرت مولانا مرحوم کا خاص موضوع تھا، درس وتدریس اور تجزیہ وصحافت آپ کی دلچسپی کے میدان تھے، قدرت کی طرف سے آپ کو لکھنے کا جو ملکہ عطا ہوا تھا وہ بے پایاں و بے مثال تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ دوسروں کو آگے بڑھایا اور خود کو پیچھے رکھا، اپنے کو فنا کیا اور دوسروں کو جلا بخش دی، مولانا کی پوری زندگی کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ کی مصداق تھی، انھوں نے ''جو بڑھ کر ہاتھ میں اٹھالے مینا اسی کا ہے'' کے فلسفہ کو اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا تھا، وہ اس کو کوتاہ دستی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایثار وقربانی خیال کرتے تھے۔

آج کا دن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ایک بار پھر صبر آزما بن گیا ہے، اس کے اہم ستونوں میں سے ایک ستون گر گیا، سلسلۃ الذہب کی ایک اور کڑی ٹوٹ گئی، تفکر وتدبر کا ایک چشمہ اور خشک ہو گیا، اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، ہماری مادر علمی کو حضرت والا کا نعم البدل عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ سے خاص طور پر دعا ہے کہ وہ ہم سب کے مشفق ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کو صبر وحوصلہ عطا فرمائے، ان کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے، سچ یہ ہے کہ مولانا واضح صاحب کا حادثہ وفات حضرت مولانا مدظلہ کے لیے انتہائی صبر آزما مرحلہ ہے، ہم نے جب سے آنکھیں کھولا دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھا، آج ہمارے حضرت مولانا اپنے عزیز بھائی سے بچھڑ گئے، اپنے رفیق دیرینہ، اپنے ہمدم وہم نشیں، اپنے ہم راز ورفیق سفر اور مشیر کار سے بچھڑ گئے بلکہ انھوں نے اپنے دست راست کو کھو دیا، وہ نمونہ اسلاف حجرہ، اس میں سادہ سے دو بستر، دونوں ہمہ وقت ساتھ ساتھ رہتے، بلکہ کہنا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے، دو قالب ایک جان کی عملی صورت اگر دیکھنا ہو تو ان دونوں حقیقی برادران باصفا کی زندگی کو دیکھا جا سکتا ہے، موت تو بہر حال موت ہے، اس کا آنا برحق ہے، اس سے کس کو رستگاری ہے، وہ چپکے سے آ کر کان میں کچھ کہتی ہے اور زندگی خاموش ہو کر رہ جاتی ہے، یہی تو ہوا، اچانک! ہاں اچانک موت آئی اور حضرت مولانا واضح صاحب ہنستے مسکراتے نفس مطمئنہ کے ساتھ نہ صرف اپنے دیرینہ رفیق کو داغ مفارقت دے گئے بلکہ پوری ندوی برادری کو سوگوار کر گئے، ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں اور صبح سے ہی ایک دوسرے کی تعزیت کر کے اپنا غم غلط کر رہے ہیں، پوری ندوی برادری، ہمارا ادارہ اور ہمارے ادارے کے متعلقین وذمہ داران سبھی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے، ان کی بے لوث خدمات کا انھیں اجر عظیم عطا فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، حضرت مولانا مدظلہ کو صبر واستقامت نصیب فرمائے، تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ندوۃ العلماء کے لیے مولانا کے نعم البدل کا انتظام فرمائے، خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

انا لله وانا اليه راجعون، اللهم اغفره وارحمه وارفع درجاته واحشره مع النبيين والصديقين والشهداء۔

اداریہ

ہماری حالتِ زار اور ہمارا انتشار

حالات کی سنگینی کا شکوہ ہر زبان پر ہے، اغیار کی سازشوں کا تذکرہ ہر تقریر و تحریر میں ہے، مگر افسوس کہ ان حالات سے نمٹنے اور ان سازشوں کو ناکام کرنے کی کوئی تیاری اور کوئی منظم و مرتب لائحہ عمل ہمارے پاس نہیں ہے، جس قدر تیزی کے ساتھ ملک کے حالات تبدیل ہو رہے ہیں، آزادی پر جس طرح قدغن لگائی جا رہی ہے، بلکہ یہ کہیے کہ دنیا بھر میں جس طرح مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے، اور اس کے جو اثرات اس ملک کے مسلمانوں پر خدانخواستہ پڑنے والے ہیں اس کا شاید صحیح معنی میں ہم کو اب تک احساس بھی نہیں ہے، زندگی ہے، جو اللہ کے بھروسہ گزر رہی ہے، زندگی کی دوڑ میں ہم کس حد تک شامل ہیں، نظام زندگی میں ہمارا کردار کتنا مؤثر ہے، فصل بہار پر ہمارا کتنا حق ہے، ان پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت بھی ہم نہیں سمجھتے، زمانہ بدلتا ہے، قدریں بدلتی ہیں، تقاضے بدلتے ہیں، ان تبدیلیوں کے پیش نظر قومیں اپنے مستقبل کا خاکہ تیار کرتی ہیں، مگر صد افسوس کہ ہم پرانی رتوں کے مارے اپنے حلقہ ارادت میں خوش خرم اپنی زندگی گذارنے پر قانع، افتراق و انتشار کی جو حقیقی اور زمینی صورت حال ہے وہ انتہائی کرب ناک، مہلک اور تباہ کن ہے، دوسرے کو برداشت کرنے، دوسرے کی رائے کا اختلاف کے باوجود احترام کرنے کی صلاحیت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے، اتحاد کے کھوکھلے اور بے معنی نعرے سب لگاتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اپنی قیادت و سیادت سے نیچے اتر کر کوئی کسی سے اتحاد نہیں کرنا چاہتا، ایک عجیب منتشر صورت حال ہے جس سے امت گزر رہی ہے، امت میں مخلصین کا ایک ایسا طبقہ ہے جو کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا، یا یوں کہیے کہ اس میں کچھ کر گزرنے کی طاقت ہی نہیں، ایک وہ طبقہ ہے جو بہت کچھ کر گزرنا چاہتا ہے، مگر نہ اس کے پاس مناصب ہیں نہ وسائل، ان دونوں کے درمیان ایک اور طبقہ ہے جس میں ہر طرح کے مخلص و غیر مخلص سبھی لوگ شامل ہیں، اس طبقہ کے پاس سب کچھ موجود ہے مگر افسوس کہ جو کچھ نظر آتا ہے حقیقت میں وہ ہوتا نہیں، طویل سفر کے بعد نتیجہ جو کچھ ہے وہ سامنے ہے۔

ملک کی بڑی سے بڑی کسی تنظیم یا ادارے کے پاس قومی فلاح و بہبود کا کوئی ایسا منصوبہ نہیں جس کی بابت وہ یہ دعویٰ کر سکے کہ اس پر عمل کر کے قوم کو آئندہ پانچ یا دس سال میں تعلیمی/ سیاسی یا معاشی استحکام حاصل ہو سکتا ہے، بے سمت سفر جاری ہے، قرآن کے تصور عروج و زوال اور سیرت نبوی کے مرحلہ وار منہج سے آنکھیں بند کر کے قدیم و جدید کی بحثیں ہیں، یہ حق پر یا وہ حق پر، یہ تنظیم اچھی یا وہ اچھی، یہ گروہ مفید یا وہ، یہ نظریہ تحفظ و بقا کا ضامن یا وہ کے لغو مباحثوں میں امت کی ترقی کے حل تلاش کیے جا رہے ہیں، غیروں کی تنظیمیں زمینی سطح پر اس طرح کام کرتی ہیں کہ ایک طرف ان کا کیڈر تیار ہوتا ہے، دوسری طرف وہ ذہنوں کو تشکیل دیتے ہیں، سسٹم میں افراد داخل کرتے ہیں، معیشت پر تسلط حاصل کرتے ہیں اور اس طرح پورے ملک کے نظام پر مسلط ہو جاتے ہیں، ہماری تنظیموں نے کبھی دفاع و تحفظ سے آگے کچھ سوچا ہی نہیں، تحفظ کی پالیسی اور دفاع کی ذہنیت قومی زندگی کی ضمانت نہیں

دے سکتی، مکہ مکرمہ میں کسمپرسی کے عالم میں بھی اقدامی کوشش کا حکم دیا گیا تھا، اگر چہ اس کوشش کا انداز محض دعوتی تھا، مگر فرمایا گیا تھا کہ وجاھدھم بہ جھادا کبیرا اس قرآن کے ذریعہ ان سے بڑا جہاد کرو یعنی ان سب پر قرآن کی حجت قائم کردو، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے سامنے قرآن کی حجت کیا قائم کرتے ابھی تک اپنے ہی بقاء وتحفظ کو یقینی بنانے کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں، جس دن پارلیمنٹ میں طلاق ثلاثہ بل پر مباحثہ ہوا اس دن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ ایک غیر مسلم ہندو خاتون رنجیت رنجن نے جس طرح قرآنی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم فخر سے کہتے ہیں کہ قرآن میں جو طریقہ طلاق کا بیان کیا گیا ہے، وہ دنیا کے کسی مذہب میں نہیں بیان کیا گیا، اس طرح پارلیمنٹ کا کوئی مسلم ممبر بھی گفتگو نہ کرسکا، افسوس ہے کہ جب سے یہ مسئلہ چھڑا تب سے اب تک اس مسئلہ پر بھی محض دفاعی پالیسیاں اختیار کی جاتی رہیں، کاش ہماری ملی تنظیمیں قرآن کا بیان کردہ طریقہ علحدگی نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں تک پہنچانے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہر گلی اور ہر محلّہ تک اس کو پہنچانے کی مہم چھیڑ دیتیں، مگر نہیں! یہاں تو کریڈٹ لینے کی مذموم ہوڑ چل پڑتی ہے، رنجیت رنجن نے اگر یہ مؤثر بیان دیا تو کیوں دیا، اور کس کے سکھانے اور بتانے پر دیا؟ جب یہ اس قوم میں بحث کا موضوع ہے تو پھر اس قوم کا انجام کیا ہوگا۔

جس قوم کی اجتماعیت قدیم وجدید میں تقسیم ہوتی ہو، مسلکی عصبیت، علاقائی تعصب، خاندانی تسلط اور تنظیمی خانہ جنگی جس قوم کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرتی ہو، یہی نہیں بلکہ شخصی حلقہ بندی جس قوم میں تقسیم در تقسیم کو فروغ دیتی ہو اس قوم کو صحیح راستہ پر لانے کے لئے چھوٹی چھوٹی ٹھوکریں کافی نہیں ہوتیں، پھر اس کو کسی طوفانی تھپیڑے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر اس قوم کو جانوں کے نذرانے ادا کرنے پڑتے ہیں، غلامی کی زندگی گذارنا پڑتا ہے، اس کی عزت نفس خاک میں ملادی جاتی ہے، قرآن مجید نے اس قدر تفصیل سے بنی اسرائیل کے حالات کو یوں ہی نہیں بیان کیا ہے، بنی اسرائیل جس ڈگر پر چلے یہ امت آج تقریباً اسی ڈگر پر چل رہی ہے، اس امت کا ہر طبقہ بنی اسرائیل کے اپنے ہم منصب طبقہ کی راہ پر چل پڑا ہے، گویا نبی پاک ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہورہی ہے، عہد جدید کی تاریخ میں جدیدتر کی کی تعمیر بھی یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ جب جمود وتعطل اور انتشار حد سے گذرتا ہے تو پھر کسی سخت گیر کے ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ پھر اسی کے نتیجہ میں انقلاب کی لہریں اٹھتی ہیں۔

اس ملک میں مسلمانوں کی غیر شفاف اور غیر واضح پالیسیاں، اجتماعی جمود وانتشار اور ملی نعروں کے پسِ پردہ جماعتی وتنظیمی حلقہ بندی اور اپنے اپنے حلقہ اثر کی توسیع پسندی اور دیگر انفرادی مفادات کی دلچسپیوں نے مسلمانوں کو بالکل بے اثر بنا کر چھوڑ دیا ہے، ملک کے طول وارض پر نظر دوڑایئے تو سب سے زیادہ ۲۰۱۹ء کے انتخابات کو لے کر یہی قوم پریشان نظر آئے گی، مگر پریشانی کا حل پوچھیے تو کسی کے پاس نہیں ہوگا، اتحاد پر تقریریں کرنے کو کہہ دیجئے تو نیتاؤں سے لے کر مقرروں تک سب کی تقریریں ملت کے آنسوؤں سے دریا جاری کردیں، مگر ایک پل کے لیے ایک نکتہ پر بھی عملاً متحد ہوجائیں، دور دور تک اس کا امکان نہیں، یہ کوئی ہوائی دعویٰ نہیں بلکہ تلخ حقیقت ہے، ہر تنظیم اور ہر ادارہ آپسی کشمکش میں مبتلا، آپس میں ہی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں، اپنوں کے خلاف سازشیں، پگڑیاں اچھالنے، تنقیص وتضحیک کرنے اور غیبتوں کا بازار گرم کرنے میں کوئی کسی سے کم نہیں، وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی مقصد نہیں، کوئی ہدف نہیں، ہماری منزل موہوم ہے باوجود اس کے کہ ہم ہی کو رہبری کا منصب عطا ہوا تھا اور ہم ہی کو منزل تک رہنمائی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اسی لیے ہمارا سفر محض وقت گذاری کے لیے جاری ہے،

روزگار کے دروازے توکّل کا دلاسہ دے کر بند کر دیے جاتے ہیں، بے روزگاری میں پھر یہی سب بے مقصد کام انجام پاتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔

یہ سب تلخ حقائق ہیں، جن کو نہ کوئی بیان کرنا چاہتا ہے اور نہ کسی میں سننے کی تاب ہے، مگر یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا، ایک بار اپنا احتساب کرنا پڑے گا، جب تک اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی کوتاہیوں پر نظر نہ ڈالی گئی تب تک صحیح لائحہ عمل تیار نہیں ہوگا، سب سے بڑا نقص اور نقصان یہ ہے کہ کوئی شخص خود کو یا اپنے علم کو یا اپنے نظریہ کو یا اپنے طریقہ کو کامل و مکمل سمجھ لے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر تنظیم، ہر ادارہ اور ہر شخص کو دعوی کمال ہے، کہ اسی کا طریقہ اسی کا نظریہ کامیاب و کامران ہونے کی ضمانت ہے۔

ہم کو اس غلط فہمی سے نکلنا پڑے گا، سیرت رسول کی روشنی میں از سر نو سفر شروع کرنا پڑے گا، دعوتِ دین کو بنیادی طور پر ترجیحات میں شامل کرنا پڑے گا، اپنے تعلیمی نظام اور سیاسی نظریہ کا صحیح طور پر محاسبہ کرنا پڑے گا، اگر یہ کام مخلصانہ طور پر کیے جائیں تو مناسب و موثر لائحہ عمل تیار ہوسکتا ہے، ورنہ نظریات کی بھیڑ تو ہے ہی، خواہ ثمرات ظاہر ہوں یا نہ ہوں، فلسفے ہیں، جلسے ہیں، نعرے ہیں، دعوے ہیں، بیساکھیاں ہیں، جبکہ ان میں سے کوئی چیز بھی قومی زندگی کی ضمانت نہیں، مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ یقین محکم، عزم مصمم اور جہد مسلسل کے ساتھ آگے پڑھیں، اب وہ بیساکھیوں کے بجائے اپنی پالیسیاں بنائیں اور دوسروں کو اس میں شریک کریں۔

اوروں کے بنانے سے تقدیر نہیں بنتی
ہم جہد مسلسل سے تقدیر سنواریں گے

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ سب کرنے کے لئے تو وقت درکار ہے، اگرچہ ابتدا ابھی سے ہوسکتی ہے، مگر فی الحال تو عام انتخابات اور اس کے دوررس اثرات کا سامنا ہے، کیا مسلمان اور مسلمانوں کی قیادت اللہ کے لیے ایک پلیٹ فارم پر آکر ایک ایسی کمیٹی تشکیل دے سکتی ہے جو ہر ہر علاقہ کے امیدوار کا سروے کرے اور پھر اس علاقہ کے ذمہ دار لوگوں تک خاموشی سے یہ بات پہنچادے کہ ہمارے سروے کے مطابق فلاں فلاں کا یہ حال ہے، اور فلاں کے نکل جانے کی امید ہے اور ہماری ملی قیادت کا یہی پیغام ہے کہ ملکی صورت حال اور اس زمینی سروے کے پیش نظر باقی سب سے آنکھ بند کر کے اس کو کامیاب کیا جائے جس کے جیتنے کی امید ہے، خواہ وہ کسی بھی جماعت کا نمائندہ ہو، کیا مسلمانوں کو انتشار سے بچانے کے لیے، ان کے ووٹ کو مؤثر بنانے کے لیے یہی ایک چھوٹا سا مگر بہت موثر اور خاموش اقدام کیا جاسکے گا؟؟

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

رپورٹ

رپورٹ جلسۂ تعزیت بروفات حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ

(ادارہ)

آج ۱۷ جنوری بروز جمعرات بعد نماز مغرب مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ کے لیکچر ہال میں حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال کی نسبت سے ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر سید احتشام احمد ندوی صاحب نے کی، جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور شہر علی گڑھ کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔

مدرسہ کے طالب علم عبدالباسط کی تلاوت سے مجلس کی آغاز ہوا۔ اس کے بعد مدرسے کے مہتمم ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے مجلس کی نظامت کرتے ہوئے اس شعر سے اپنی بات شروع کی۔

سحر جو آئی تو لائی اس چراغ کی موت
تمام عمر جو جلتا رہا سحر کے لئے

ڈاکٹر صاحب نے آگے فرمایا: مولانا کا سانحۂ ارتحال صرف ان کے خاندان کے لیے ہی نہیں، بلکہ پوری ندوی برادری اور پوری انسانیت کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے۔ مغرب کے علوم اور مغربی مصادر اور مغربی تہذیب اور اس کے مفکرین پر ان کی ایسی نظر تھی کہ ان کا اس دور میں اس وقت کوئی ثانی نہیں تھا، پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب نے ابھی چند دنوں پہلے اپنے ایک مضمون میں مولانا کو مفکرین کی فہرست میں سرفہرست رکھا تھا، تمام اداروں کے تعزیت ناموں میں مولانا کو مفکر اسلام تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ہمیشہ خود کو پیچھے رکھا۔ دوسروں کو آگے بڑھایا، اس صفت میں وہ منفرد تھے۔ جب وہ بولنا شروع کرتے تھے تو لگتا تھا جیسے الفاظ کا سیل رواں ہو جو روکے نہ رکتا ہو۔ آج فضلاء ندوہ میں بالخصوص پرانے ندویوں جنہیں بھی قلم پکڑنے کا سلیقہ ہے یا جو عربی میں لکھتے ہیں، وہ سب مولانا کے تربیت یافتہ ہیں، یہ لوگ اعتراف کرتے ہیں کہ مولانا نے ہمیں قلم پکڑنا سکھایا۔ مولانا کا قرآن کا ذوق بہت اعلی تھا۔ مغرب اور فجر بعد تلاوت کا معمول رہا اور وہ بڑے والہانہ انداز میں تلاوت کیا کرتے تھے۔ حدیث سے گہرا تعلق تھا۔ ان کا سب سے اعلی وصف ان کی تواضع تھی۔ مولانا نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی ایک بڑی کہکشاں چھوڑی ہے، جو اس وقت مختلف میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس کے بعد پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب نے اپنے درد وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا: مولانا صاحب علم تھے۔ اور معرفت ربانی کی وجہ سے ہی ان میں انکساری تھی۔ مولانا کے یہاں مہمانوں کے تئیں، بڑا زبردست اکرام تھا۔ کبھی کبھی میں مولانا رابع صاحب اور مولانا واضح صاحب کے پاس ایک ایک ہفتے ٹھہرا ہوں، میں نے ان دونوں حضرات میں جو انکساری اور فروتنی

دیکھی، وہ بہت کم کہیں اور دیکھنے کو ملی، ان کے ٹفن اپنے گھر سے آتے تھے اور اس میں بڑا سادہ کھانا ہوتا تھا۔ ہمیشہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ قرآن وحدیث میں مومن کے جو مطلوب اوصاف بیان کیے گئے ہیں، ان دونوں حضرات میں اس کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کر دیتے تھے۔ طویل گفتگو کو مختصر لمحوں میں بیان کرنے کا انھیں فن آتا تھا۔ نقد کا جو شعور تھا، وہ مولانا میں تھا۔ مولانا صاحب زبان تھے اور زبان کی باریکیوں سے واقف تھے۔

ان کے بعد انجینئر خالد فریدی صاحب نے اپنے احساسات ذکر کرتے ہوئے کہا مولانا واضح صاحب میرے ماموں بھی تھے، خالو بھی تھے۔ میں نے انھیں اور ان کے بھائیوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ جب ہم وہاں جاتے تھے تو بڑی محبت سے پیش آتے تھے، میں نے انھیں سنہ ۱۹۵۰ء سے دیکھا ہے، میں نے اپنی زندگی میں والدین کے اتنے تابعدار بچے نہیں دیکھے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کرتے تھے ان کے والد نے انھیں ملازمت چھوڑنے کے لئے کہا، انھوں نے فوراہی استعفیٰ دے دیا۔ یہ ان کی سعادت مندی کی عظیم مثال ہے۔ انھوں نے اس خاندان کی خصوصیات اور سادگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی وہاں دو دن پہلے بچوں کو پتہ ہوتا ہے کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے، انھوں نے مولانا واضح صاحب کے زہد وقناعت اور قرابت داری کا پاس ولحاظ رکھنے کی خصوصات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ مولانا واضح صاحب بہت زیادہ قناعت والے تھے، میں نے ایسی قناعت کہیں نہیں دیکھی۔

ان کے بعد پروفیسر عبدالباری صاحب نے کہا کہ مولانا واضح صاحب علم کی آبرو تھے، اگر کسی کو علم کی آبرو دیکھنی ہوتی، تو وہ مولانا واضح صاحب کو دیکھ لیتا، ورنہ علماء تو میں نے بہت دیکھے ہیں، انھوں نے کہا کہ وہ مجلس میں اور اسٹیج پر ہوتے ہوئے بھی اپنے موجود ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے، یہ ان کا ایسا وصف تھا جس مین کوئی دوسرا ان کا ثانی نہیں۔

ان کے بعد پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا مولانا کی وفات پوری انسانیت کے لئے بڑے صدمے کی بات ہے، وہ بڑے عظیم انسان اور جلیل القدر عالم تھے، ایسے لوگ بڑی مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے قرآنی آیات سے اپنی گفتگو کو مزین کیا، مولانا سے اپنے تعلقات کا تذکرہ کیا، ان کی نمایاں خصوصیات اور علمی وزن داری کا ذکر کیا۔

اخیر میں صدر محترم پروفیسر احتشام صاحب نے اپنے درد وغم کا اظہار کیا، انھوں نے کہا کہ میرا مولانا سے بڑا گہرا تعلق تھا، انھوں نے اپنی یادوں اور رفاقتوں کا بھرپور تذکرہ کیا، وہ بڑے آدمی تھے، بہت بڑے عالم تھے، اور میرے سب سے بڑے دوست تھے، ان کے مضامین اور ان کی تحریریں نشان راہ ہوتی ہیں، ان کے چلے جانے سے ملت کا بڑا خسارہ ہوا ہے، اللہ سے دعا ہے کہ ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ اور متعلقین واحباب کو صبر جمیل سے نوازے۔ صدر جلسہ کی دعا پر اس مجلس کا اختتام ہوا۔

اس موقع پر علی گڑھ شہر کے ممتاز حضرات اور نامور شخصیات نیز مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے جمیع اساتذہ وطلبہ موجود رہے۔

☆☆☆

پیام سیرت

دل بدلتے دیر نہیں لگتی

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''بولو! کیسے آنا ہوا؟''۔

''جی بس ویسے ہی آیا تھا.....میرے کچھ بھائی بند آپ کی قید میں ہیں، ان کی رہائی کے لیے''۔

''سچ بتاؤ کیسے آنا ہوا.....اور یہ گردن میں تلوار کیسی لٹک رہی ہے؟''۔

''وہ میں اتارنا بھول گیا.....یونہی غفلت میں لٹکی رہ گئی''۔

اس نے سفید جھوٹ بولا.....اور سچ چھپانے کی کوشش کی۔

یوں تو وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

مگر اِس وقت اُس کے سینے میں جو آگ لگی تھی.....اس نے اس کی زبان پر جھوٹ چڑھوا دیا۔

وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

غصے سے اس کی رگ رگ پھٹے جا رہی تھی۔

نفرت کی گھناؤنی چادر نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اس کی نفرت اتنی شدید تھی کہ اس کے سامنے جذباتی محبت بھی ٹک نہ سکی تھی۔

جی ہاں.....وہ نفرت کی دیوی پر اپنے بچوں کی محبت کو بھینٹ چڑھا کر آیا تھا۔

اف فوہ!.....انسان کسی سے اتنی نفرت بھی کر سکتا ہے!!

نفرت اور غصہ.....دونوں اپنی انتہاؤں پر تھے۔

کتنی سچ ہے یہ کہاوت کہ غصہ آدمی کو پاگل کر دیتا ہے۔

وہ سچ مچ پاگل ہو چکا تھا۔

اس کے سینے میں انتقام کا طوفان موجزن تھا۔

اور وہ اسی طوفان کے ساتھ مکے سے روانہ ہوا تھا۔

تعجب تو یہ ہے کہ کئی دن کا طویل سفر بھی اس طوفانِ بلاخیز کو سرد نہ کر سکا تھا۔

مدینے میں داخل ہوتے ہی اس نے مسجد نبوی کا رخ کیا۔

دروازے پہ پہنچا تو عمر فاروق سے آنکھیں چار ہوئیں۔

عمر فاروق تیزی سے آقا کی خدمت میں لپکے اور عرض کیا:

''عمیر کو کسی قیمت پر امان نہ دیجیے گا''۔

حکم ہوا: لے آؤ۔

دل میں تکمیل آرزو کا ارمان لیے.....گردن میں تلوار لٹکائے.....حاضری دی۔

بس چند لمحے باقی تھے۔

اسے لگا جیسے آج وہ انتقام کی پیاس بجھالے گا۔

اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ دستۂ تلوار تک پہنچتا.....اس سے آنے کا مقصد پوچھ لیا گیا۔

سوال میں اتنی مٹھاس تھی کہ وہ خاموش نہ رہ سکا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یک دم حملہ کر بیٹھتا.....مگر ایک لمحے کی تاخیر کیا ہوئی کہ اس کی زندگی بدل گئی۔

اس نے جواب تو جھوٹا دیا.....لیکن اگلی بات سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

''بتاؤ.....کیا تم صفوان سے کیے گیے اپنے وعدے کو پورا کرنے نہیں آئے؟''۔

اسے لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔

یہ بات تو اس کے اور صفوان کے علاوہ کسی تیسرے شخص کے علم میں نہ تھی۔

''پھر انھیں کیسے پتہ چلا کہ میں نے صفوان سے کیا وعدہ کیا ہے''۔وہ سوچنے لگا۔

''ہو نہ ہو یہ اللہ کے رسول ہیں جنھیں اللہ کی طرف سے غیب کی باتیں بتادی جاتی ہیں''۔اس کے اندر سے آواز آئی۔

''آپ کو کیسے معلوم کہ میرے اور صفوان کے بیچ کیا بات ہوئی؟''۔وہ پوچھ بیٹھا۔

''کیا تم نے اس شرط پر اس سے مجھے قتل کرنے کا وعدہ نہیں کیا کہ وہ تمھارے بچوں کی دیکھ بھال کرے اور تمھارا قرض ادا کردے؟''۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ﷺ''۔بے اختیار زبان سے نکل پڑا۔

جو تلوار محمد ﷺ کا سر قلم کرنے آئی تھی.....وہ ان کے قدموں میں ہی جھک گئی۔

وہ جو محبت لے کر آئے تھے.....وہ جو رحمتِ دو عالم بن کر آئے تھے.....وہ جو پیام الفت لائے تھے.....اسی طرح نفرت کو محبت میں بدل دیتے تھے۔

لوگ ان کے پاس نفرت کی آگ لے کر جاتے .....اور محبت کی شبنم لے کر واپس ہوتے۔

وہ اسی لیے آئے تھے کہ نفرت کے کھیت میں محبت کے پھول کھلائیں۔

وہ اسی لیے آئے تھے کہ دنیا میں رحمت ومحبت کی ہوا چلائیں۔

جو بھی ان کے پاس پہنچ جاتا.....ان کا ہو جاتا۔

وہ آیا تھا ان کا سر قلم کرنے.....مگر خود اس کا سر ان کے قدموں میں خم ہو گیا۔

عمیر نام تھا اس کا .....وہب کا بیٹا.....بہادر ونڈر ..... معزز وسربرآوردہ۔

صفوان اس کا دوست تھا.....امیہ کا بیٹا .....اور سرخیلِ مشرکین۔

جنگ بدر کے بعد کی بات ہے کہ ایک دن دونوں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے:

''مقتولین بدر کے بعد زندگی کا مزہ جاتا رہا''۔صفوان نے آہِ سرد کے ساتھ کہا۔

''ہاں سچ کہتے ہو یار''۔عمیر نے تائید کی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر عمیر نے مایوسانہ انداز میں کہا:

''اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بال بچوں کے مستقبل کی فکر نہ ہوتی تو محمد (ﷺ) کو قتل کر کے یہ قصہ ہی تمام کر دیتا''۔

آہ! لوگ کس کے قتل کے منصوبے بنا رہے تھے!

اس کے، جو انھیں ہر غم سے نجات دلانے آیا تھا؟

اس کے، جو ان کا مسیحا بن کر آیا تھا؟

اوہ!.....کتنے نادان تھے وہ!!

''یہ بھی کوئی فکر کرنے کی بات ہے!.....تمھارا قرض میرے ذمے.....اور آج سے تمھارے بچے میرے بچے.....''۔

صفوان پر باپ کے خون کا انتقام سوار تھا.....جو جنگ بدر میں جہنم واصل ہو چکا تھا۔

وہ اِس کے لیے ہر ذمہ داری لینے اور ہر بوجھ اٹھانے کو تیار تھا۔

عمیر نے اس کا جواب سنا تو خوشی سے چہک اٹھا۔

اور رسول اللہ ﷺ کے قتل کی تیاری شروع کر دی۔

مگر قدرت کی کرشمہ سازی کہ جو انھیں شکار کرنے گیا تھا.....وہ خود ہی شکار ہو گیا۔

عمیر نے اسلام قبول کرنے کے بعد حضور ﷺ سے مکہ واپس جانے کی اجازت چاہی تا کہ وہاں جا کر اسلام کی تبلیغ کر سکیں۔

آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی۔

وہ مکے کے لیے روانہ ہو گئے۔

ادھر صفوان لوگوں سے کہتا پھرتا کہ بس چند دنوں کی بات ہے تمھیں ایک عظیم خوش خبری سننے کو ملے گی۔

مدینے سے آنے جانے والوں سے دریافت کرتا کہ مدینے میں کوئی اہم واقعہ تو نہیں پیش آیا۔

وہ بڑی شدت کے ساتھ عمیر کی واپسی کا منتظر تھا۔

ایک دن اس نے یہ خبر سنی کہ عمیر نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

یہ خبر اس کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

کرتا بھی تو کیا کرتا.....بس پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

پانچ چھ سال تک وہ یوں ہی مارا مارا پھرتا رہا۔

پھر اسے بھی دربارِ محمدی میں ہی سکون ملا.....چنانچہ فتح مکہ کے بعد صفوان نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

عمیر کا اسلام لانا محمد ﷺ کے رسول ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تعجب ہے لوگ ایسے واقعات پڑھتے ہیں اور پھر بھی رسالت محمدی کا انکار کر جاتے ہیں!!

رسالت محمدی کے اور دلائل تو ایک طرف.....ان کے دشمنوں کی زندگی میں بھی اس کے سیکڑوں ثبوت ہیں.....بس ذرا کوئی ان پر نظر تو کرے!!

☆☆☆

□ فقہیات

پیش آمدہ مسائل میں احوالِ زمانہ کی رعایت اور حدود

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی
خادم تدریس دارالعلوم حیدرآباد

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مسلمان اللہ تعالی کے احکام سے آزاد ہو۔ مسلمان اللہ کا غلام ہے، ایسا غلام جو ہر چھوٹا بڑا کام اپنے آقا کے چشم و ابرو کے اشارہ پر کرتا ہو، جس کی نظر میں اپنے مالک کے لئے کھونا ہی پانا اور مرنا ہی جینا ہو، اور جو اپنے خدا کے لئے لٹ جانے ہی کو سب سے بڑی سرفرازی اور کامیابی تصور کرتا ہو۔ قرآن وحدیث میں شریعت کے جو احکام آئے ہیں وہ اسی ہمہ گیر اطاعت و فرماں برداری کا ذریعہ ہیں۔

قرآن وحدیث کے احکام میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور وہ ہمیشہ اسی تفصیل کے ساتھ رہیں گے، لیکن اجتہادی احکام کی بنیاد بعض اوقات وقتی حالات وروا جات اور موجودہ حالات ومسائل پر ہوتی ہے، ایسے احکام پر بدلتے ہوئے حالات کا اثر پڑتا ہے، اسلامی قوانین میں بعض حصوں کا ہمیشہ اپنی حالت پر قائم رہنا جہاں اس کو استحکام اور عدل وانصاف قائم کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف فقہ وفتاویٰ میں اپنے عہد کو قبول کرنے کی صلاحیت اس کو ہر زمانے میں قابل عمل بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

احوال زمانہ کی رعایت کی مختصر تاریخ اور حیثیت:

تبدیلیٔ احوال سے تبدیلیٔ احکام اسلام کا مزاج ہے، کیونکہ اسلام دین فطرت ہے، نیز اسلامی معاشرے میں تبدیلی کا آنا ایک لازمی امر ہے، **وما جعل علیکم فی الدین من حرج** (الحج: ۷۸) اور **یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر** (البقرۃ: ۱۸۵) جیسی آیات سے اس مزاج کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تنفیذ احکام میں تدریجی حکمت عملی اور نفاذ شریعت میں اہتمام نسخ بھی احوال زمانہ کی رعایت پر شاہد عدل ہیں۔ قرآن وحدیث میں نسخ کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ حالات وزمانہ کی بنیاد پر شرعی احکام میں تبدیلی کی بنیادیں خود قرآن وحدیث نے رکھی ہیں، جیسے تندرست وبیمار کے لئے نماز وروزہ کے احکام میں تبدیلی کا ہونا، صاحب ثروت اور مالدار ہونے کی حالت میں زکات وحج کا حکم اور نہ ہونے کی صورت میں ساقط ہوجانا، حالت اکراہ میں ایمان کے لئے اقرار باللسان کا بھی ساقط ہوجانا، مکے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر واستقامت کی زندگی گزارنا۔ پھر ہجرت کا حکم اور مدینہ میں جہاد کا آغاز، صلح حدیبیہ کا قصہ، یہود ومنافقین کے ساتھ رعایتی معاملات کا ہونا وغیرہ۔

عہد نبوت کے بعد عہد صحابہ میں بھی احوال زمانہ کی رعایت

خوب نظر آتی ہے: حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جمع قرآن کا حکم دینا، شراب کی حد کا تعین، حضرت عمر فاروقؓ کا اہل کتاب سے نکاح کو منع کرنا، مصارف زکات سے مولفۃ القلوب کو ساقط کر دینا، خواتین کو مسجد میں آنے سے منع کرنا۔ حضرت عثمانؓ کا ایک صحیفہ کے علاوہ باقی صحیفوں کو جلانے کا حکم دینا، جمعہ کی اذان کا اضافہ کرنا، حضرت علی مرتضیٰؓ کا خاص حالات میں بنی تغلب کے اہل کتاب کے ذبیحہ سے روک دینا، شرابی کی سزا کو اسّی کوڑے کر دینا جو کہ پہلے چالیس کوڑے تھی یہ سب رعایت احوال زمانہ کی مثالیں ہیں۔

اسی مزاج کو سامنے رکھ کر بعد کے مجتہدین فقہاء نے احوال زمانہ کو مسائل کے استنباط واستخراج میں خاص اہمیت اور حیثیت دی۔ خلافت عثمانیہ ترکی کے مرتب کردہ مجموعہ قوانین اسلامی "مجلة الأحكام" کے فاضل مرتبین نے ایک مستقل قاعدہ فقہیہ کی حیثیت سے یہ اصل مقرر کی ہے: لا ينكر تغير الأحكام بتغير الأزمان (شرح المجلہ: المادۃ:۹۳)۔

علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی:۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

''بہت سے احکام ہیں جو زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں، اس لے کہ اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے، نئی ضرورتیں پیدا ہوجاتی ہیں، اہل زمانہ میں فساد اخلاق پیدا ہوجاتا ہے، اب اگر حکم شرعی پہلے ہی کی طرح باقی رکھا جائے تو یہ مشقت اور لوگوں کے لیے ضرر کا باعث ہوجائے گا اور ان شرعی اصول وقواعد کے خلاف ہوجائے گا جو سہولت اور آسانی اور نظام کائنات کو بہتر اور عمدہ طریقہ پر رکھنے کے لئے ضرر و فساد کے ازالہ پر مبنی ہیں''۔ (رسائل ابن عابدین: ج:ص:۱۲۵ سہیل اکیڈمی لاہور)۔

علامہ ابن نجیم (م:۹۷۰ھ) نے اپنی کتاب الأشباہ و النظائر میں ''الضرر يزال'' اور'' العادة محكمة'' کے تحت اس موضوع پر سیر حاصل بحث پیش کی ہے، اس موضوع کی نزاکت و اہمیت سمجھنے کے لئے اس کتاب کی متعلقہ بحث کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

اسلام کا اصل موضوع فطرت کی رعایت ہے: دیکھنے اور سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ جو چیز بدلتی ہے وہ کیا ہے؟ انسان کی فطرت بدلتی ہے یا محض اسباب و وسائل میں تغیر رونما ہوتا ہے؟ اس نکتے پر جب کوئی شخص غور کرے گا تو اسے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ شروع سے آج تک دنیا میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان کا تعلق اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے۔ مثال کے طور پر اپنے حقوق جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوشش انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ یہی چیز ہے جو دشمن کے خلاف دفاع کا محرک بنتی ہے۔ ایک زمانے میں لوگ اس کے لئے لکڑیوں اور پتھروں کا استعمال کرتے تھے پھر جب انسان لوہے کو پگھلا کر مختلف صورتوں میں ڈھالنے پر قادر ہوگیا تو اسی مقصد کے لئے'' تیر و شمشیر'' سے کام لیا جانے لگا اور اس طرح اخیر میں انسان کا جذبۂ انتقام ہلاکت خیز ایجادات تک پہونچ گیا۔ یہاں ہتھیاروں اور اس کی نوعیت میں یقیناً غیر معمولی تبدیلی عمل میں آئی ہے؛ مگر ظاہر ہے کہ اس کے پس پردہ جو انسانی فطرت کارفرما ہے وہ آج بھی وہی ہے جو کل تھی۔ حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے: احکام ،حقائق سے متعلق ہوتے ہیں اور عرف کے بدلنے سے وہ حقیقت نہیں بدلتی جس سے حکم کا تعلق تھا، صرف عرف سے اس حقیقت کی صورت بدل جاتی ہے۔ (فقہ حنفی کے اصول وضوابط ص:۱۴۵، ترتیب: زید مظاہری، زمزم پبلیشرز، کراچی) اب یہ

بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلام اور شریعت اسلامی کا اصل موضوع اسباب ووسائل نہیں ؛ بلکہ انسان اور اس کی فطرت ہے؛اس لئے احوال زمانہ کی روشنی میں ''فطرت انسانی'' کی معتدل رہنمائی اور مواقع کے اعتبار سے اس کے اقدام کے مناسب اور نامناسب ہونے کا فیصلہ کرنا ''فقہ اسلامی'' کا خاص موضوع ہے۔

احوال زمانہ اور قابل تغیر احکام کی تفصیل: (۱)۔وہ مباح جن کی اباحت پر نص وارد نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کے جائز وناجائز ہونے کی بابت نص کے سکوت کی وجہ سے ان کو مباح مان لیا گیا ہے۔اکثر انتظامی قوانین اسی نوعیت کے ہیں ؛اس لئے ہر زمانہ کے حالات اور مصالح کے اعتبار سے ان میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

(۲)۔قرآن و حدیث کی وہ اصطلاحات جن کا خود صاحب شریعت نے قطعی مفہوم بیان نہیں کیا ہے، بلکہ ان کو ہر عہد کے عرف سے متعلق رکھا ہے جیسے قبضہ،عدل وغیرہ کہ قرآن وحدیث میں ان الفاظ کا مصداق متعین نہیں ہے،اس لئے ہر عہد کے احوال کے لحاظ سے ہی اس کا مفہوم متعین ہوگا۔

(۳)۔تعزیری قوانین : حدود وقصاص کے علاوہ بے شمار سزائیں ایسی ہیں جن کی سزا شریعت میں متعین ومقرر نہیں ہے:ایسی سزاؤں کو تعزیر کہتے ہیں،حکومت وقت اور عدالت کو اختیار ہے کہ اپنے زمانہ کے سماجی حالات اور اخلاقی احوال کو سامنے رکھ کر جرم کی سزا متعین کرے۔

اسلامی قانون اور احوال زمانہ کی رعایت: احکام اسلام تین طرح کے ہیں:
قطعی،اجتہادی اور مصلحی۔

(۱)۔قطعی سے مراد وہ احکام ہیں جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں جن پر امت کا اجماع واتفاق ہو:ان میں احوال زمانہ کی تبدیلی سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسے مسائل میں نظر ثانی کی گنجائش ہوتی ہے؛ بلکہ ایسا کرنا دین میں تحریف و تصحیف کے برابر ہوگا۔

(۲)۔اجتہادی سے مراد وہ احکام ہیں جن میں نصوص میں بظاہر اختلاف اور تعارض ہوتا ہے؛یا شریعت کی دو الگ الگ نظیریں دو بالکل متضاد احکام کی متقاضی ہوتی ہیں جیسے مفقود الخبر کی بیوی کا مسئلہ ہے:حضرت علیؓ کی رائے ہے کہ چار سال انتظار کے بعد نکاح فسخ کردیا جائے،حضرت عمرؓ کی رائے ہے کہ پوری زندگی انتظار کرے۔پھر اسی اختلاف کی وجہ سے فقہاء کی رائیں بھی مختلف ہیں۔ایسے احکام میں اگر کسی زمانہ میں کسی خاص مکتب فقہ کی کسی رائے پر عمل کرنا دشوار ہوجائے اور دوسری رائے کی طرف عدول کرنا ایک ضرورت ومجبوری بن جائے تو یہ عدول جائز ہوگا جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے اپنے زمانے میں جمہور فقہاء سے مشاورت کے بعد مفقود الخبر کی بیوی کے سلسلے میں فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دیا تھا۔

(۳)۔مصلحی احکام:یعنی جو زمانے کی مصلحت اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے متعین کئے ہوں اور ان کی آراء کا مدار اپنے زمانے کے عرف،اخلاق وسیاسی حالات اور لوگوں کے اطوار وعادات پر ہو۔ان مسائل میں احوال زمانہ اور عرف وحالات کی تبدیلی کی صورت میں رائے میں تبدیلی پیدا ہوجائے گی۔اور اس تبدیلی کو عدول عن المذہب نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ یہ دراصل اصحاب مذہب ہی کے منشاء ومذاق اور فکر ومزاج کی رعایت کی پیروی سے عبارت ہے، الأشباہ والنظائر میں علامہ ابن نجیمؒ نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں مثلاً سڑک کی کیچڑ سے درگزر، پانی کی مقدار بتائے بغیر حمام

میں پانی استعمال کرنا، درخت کے نیچے گرے ہوئے پھلوں کو اٹھانا وغیرہ، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے: فهذه (كلها) قد تغيرت أحكامها لتغير الزمان إما للضرورة وإما للعرف وإما لقرائن الأحوال ،وكل ذالك غير خارج عن المذهب؛لان صاحب المذهب لو كان فى هذا الزمان لقال بها ولو حدث هذا التغير فى زمانه لم ينص على خلافها.(رسم المفتى ص: ۹۶)

امام محمدؒ کے مناقب میں ہے کہ وہ احوال زمانہ سے واقفیت کے لئے پیشہ ور لوگوں سے ان کے معاملات اور باہمی طریقۂ کار کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔

كان" محمدؒ"يذهب الى الصباغين ويسأل عن معاملتهم ومايديرونها فيما بينهم.(رسائل ابن عابدين: ج ۲ ص ۱۲)

زمانے کے بدلنے کے اسباب:

یہ بات یاد رہے کہ اختلاف زمانہ اور احوال زمانہ کی وجہ سے بدل جانے والے احکام شرعیہ میں ،اگرچہ احوال کے بدلنے سے تبدیلی آجائے لیکن پہلے احکام میں اور تبدیل شدہ احکام میں مقصد شریعت ایک ہی ہوتا ہے یعنی: شریعت کا مقصد ''منافع کا حصول اور مفاسد کو ختم کرنا'' علی حالہ باقی رہتا ہے، نیز جن احکام کے نزول کا مقصد ہی زمانے اور قوم کی اصلاح کرنا ہے وہ احکام احوال زمانہ کی وجہ سے نہیں بدلتے ؛البتہ یہ ممکن ہے کہ احوال کے بدلنے کی وجہ سے ان احکام کو عملی جامہ پہنانے کے اسباب ووسائل میں تبدیلی آجائے مثلاً حقوق کی حفاظت کا سبب اور وسیلہ ''قضا'' ہے جس میں فیصلے تنہا قاضی کے ذمہ ہوتے ہیں اور اس کا فیصلہ ایک درجہ میں قطعی ہوتا ہے: لیکن ممکن ہے کہ فیصلے ایک قاضی کے بجائے پوری جماعت کے ذمہ کر دیئے جائیں، اسی لئے عام طور پر شریعت اسلامیہ میں اسباب ووسائل کو متعین اور مشخص نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ ان کو مطلق رکھا گیا ہے، تاکہ ہر زمانے میں شریعت کے اصل مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے جو طریقہ انفع اور مفاسد کو ختم کرنے میں زیادہ مؤثر ہو، اسی کو اختیار کیا جائے۔

بنیادی طور پر زمانے کے بدلنے کے دو سبب ہیں (۱) فساد (۲) ترقی۔

(۱) کبھی زمانے کی -وہ تبدیلی جو مجتہد فیہ احکام کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے- کی بنیاد؛ اخلاقی بگاڑ، تقوی وطہارت کا فقدان اور اس جیسی چیزیں ہوتی ہیں، جن کو فقہاء ''فساد زمانہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں وہ احکام جن میں اس زمانہ کی اخلاقی سطح پر اعتماد کیا گیا ہوگا اس صالح معاشرہ کے لحاظ سے جو شرطیں لگائی گئی ہوں گی، بدل جائیں گے اور موجودہ احوال زمانہ کی رعایت ناگزیر ہوجائے گی۔

مثالیں: (الف) فقہ کا یہ اصول: اگر امین سے امانت غیر ارادی طور پر ضائع ہوجائے تو اس سے ضمان وصول نہیں کیا جائے گا، اس اصول کا تقاضہ تھا کہ صنعت پیشہ لوگوں کو دی گئی رقم کھو جائے تو ان کو اس کا ذمہ دار نہ بنایا جائے، لیکن اس کا قوی اندیشہ تھا کہ صنعت کار اس کا غلط استعمال کرتے ہوئے اس کو اپنے لئے ڈھال بنالیں اور اجرت لے کر لوگوں کو مطلوبہ اشیاء نہ دیں، اس لئے حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں فیصلہ کیا کہ کاری گروں سے ضمان لیا جائے گا اور عذر قبول نہ ہوگا، دین بیزاری کے اس دور میں اس کی حکمت خوب سمجھی جاسکتی ہے۔

(ب) گواہ قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ اس کی تحقیق کے لئے امام صاحبؒ کے دور میں خود گواہ سے پوچھ لیا جاتا تھا، لیکن بعد میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے تزکیہ کا حکم فرمایا؛ یعنی

قاضی اپنے مخصوص کارکنوں کے ذریعہ خفیہ طور پر ان گواہوں کے حالات اور کردار کی تحقیق کرے۔

(ج) پہلے فقہاء نے یہ حکم فرمایا تھا کہ ''واجب اعمال دینیہ'' مثلا: امامت، خطبۂ جمعہ، قرآن کا سکھانا اور ان کے علاوہ دیگر عبادتوں کو انجام دینے کے بدلے اجرت لینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ جو شخص ان عبادتوں پر قادر ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کو بلا معاوضہ انجام دے؛ لیکن متاخرین نے جب دیکھا کہ ان واجبات دینیہ کو لوجہ اللہ انجام دینے سے لوگوں کی ہمتیں پست ہوتی جارہی ہیں اور دوسری طرف بیت المال سے ائمہ وعلماء کو وظیفہ ملنا بھی بند ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ان کو کمانے کے لئے وقت فارغ کرنا پڑتا ہے تو انہوں نے بعض ضروری عبادات پر اجرت لینے کی اجازت دی، تاکہ مشاعر دینیہ کی حفاظت کی جائے۔

(۲) ترقی: کبھی مصلحت پر مبنی قانونی اوامر، انتظامی امور اور معاشی ذرائع کی وجہ سے زمانے کے موافق نت نئے وسائل وآلات کا پیدا ہوجانا، زمانے کی تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔ اس دوسری قسم کی وجہ سے بھی پہلے سے طے شدہ مجتہد فیہ احکام شرعیہ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جب کہ وہ احکام زمانے کے موافق نہ ہوں، اس لئے کہ اس وقت پہلے احکام کے ذریعہ یا تو نقصان وجود میں آئے گا یا وہ احکام بیکار اور ناقابل عمل ہوجائیں گے اور شریعت اس بات سے منزہ ہے۔

اس کے علاوہ احکام میں تبدیلی کی ضرورت پیش آنے کے بنیادی اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) عرف وعادت میں تبدیلی (ب) مقام: جیسے مسلم اور غیر مسلم ممالک کا فرق (ج) اقتصادی اور سیاسی نظام میں تبدیلی (د) تشبہ کا ہونا یا نہ ہونا (ہ) خوف فتنہ (و) فساد عقیدہ کا خوف۔

احوال زمانہ کی رعایت کی شرطیں:

احکام میں تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجماع اور قطعی دلیل کے خلاف نہ ہو، شریعت کے بنیادی مقاصد سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو، اس کی مصلحتوں سے اس کے مفاسد بڑھ نہ جائیں، احوال زمانہ کی رعایت کی وجہ سے کسی ثابت شدہ نص یا شریعت کے کسی قطعی اصول کو چھوڑنا لازم نہ آئے۔ وہ احوال واقعی یا اکثری ہوں، احوال زمانہ کے خلاف کوئی صراحت نہ ہو (یعنی اگر احوال زمانہ کی رعایت کے مقابلہ میں صراحت آگئی تو اب اس صریح پر عمل ہوگا اور صراحت کے مقابلہ میں احوال زمانہ اور عرف کو چھوڑ دیا جائے گا؛ کیونکہ احوال زمانہ کی رعایت کرکے کسی حکم کو ثابت کرنا دلالت کے قبیل سے ہے، اور دلالت کے مقابلے میں صراحت آجائے تو دلالت باطل ہوجاتی ہے) اور اس تبدیلیٔ احکام کا کام ایسے فقہاء کی ایک جماعت انجام دے جو فقہی بصیرت بھی رکھتی ہو، اپنے زمانے کے احکام پر بھی اس کی نظر ہو اور ورع وتقویٰ کی بھی حامل ہو۔

مثالیں: ۱: محمد بن فضلؒ نے عرف اور احوال زمانہ کی وجہ سے مرد کے ستر میں سے ''مافوق المنابت'' کے کھولنے کے جواز کا فتویٰ دیا کہا: اس کے ڈھانپنے میں ایک طرح کا حرج ہے تو فقہاء نے ان کے فتوے کو قبول نہیں کیا؛ اس لیے کہ ان کا قول صریح نص کے خلاف تھا (الأشباہ والنظائر: ص ۲۷۰ زکریا، دیوبند) اسی طرح بعض کھیلوں میں لازمی ستر کے کھولنے کی عادت کو سند جواز نہیں دے سکتے۔

۲: آج اکثر لوگ داڑھی نہیں رکھتے، نماز نہیں پڑھتے، پائجامہ ٹخنے سے نیچے پہنتے ہیں، سودی کاروبار میں ملوث ہیں۔ وغیرہ احوال زمانہ کی وجہ سے ان احکام میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

الأحكام تتغير بتغير الزمان كا پس منظر: یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ زمانے کے ساتھ تمام احکام شریعت ہی تبدیل ہوجائیں جیسا کہ کچھ اباحت پسند لوگوں کا خیال ہے، اس قاعدہ سے مراد صرف یہ ہے کہ چند احکام زمانے کی تبدیلی سے بدلتے ہیں؛ اس لئے یہاں ایسے مواقع کی نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے جہاں پر عموماً غلطی کے امکانات رہتے ہیں:

(۱) کوئی منصوص حکم تعبدی ہو لیکن اس کو معلول سمجھ لیا جائے (۲) منصوص حکم کی حکمت اور مصلحت کو علت قرار دیا جائے (۳) منصوص حکم کی اصل علت کے بجائے عرف واحوال زمانہ کو علت بنادیا جائے (۴) علت زائل نہ ہو اور علت کے زوال کا فیصلہ کردیا جائے: اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو چیزیں تعبدی ہیں جیسے: تمام عبادات، ان میں احوال زمانہ سے تبدیلی نہیں ہوتی، کیونکہ تعبدی کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اسے ماننا ہے، چاہے ہماری سمجھ میں آئے، یا نہ آئے، مصلحت وحکمت کا پتہ چلے، یا نہ چلے۔ تعبدی احکام کو کسی علت، مصلحت اور حکمت کے تابع بنا کر اس حکم میں کوئی تغیر نہیں آسکتا۔ بعض دفعہ تعبدی امر کو معلول بالعلۃ سمجھ لیا جاتا ہے، یہ غلط ہے، مثال کے طور پر ذبیحہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه** (الأنعام: ۱۲۱) یہ حکم تعبدی ہے، کیونکہ بسم اللہ پڑھنے سے بظاہر اس کے خون میں یا اس کے گوشت میں کوئی فرق نہیں پڑتا جیسے خون پہلے تھا ویسے ہی اب بھی خون ہے، خون پہلے بھی نکلا تھا، اب بھی نکلا ہے؛ لیکن بسم اللہ نہیں کہا تو جانور حلال نہیں، لہذا اس کے اندر زمانے کی تبدیلی سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ احوال زمانہ کی وجہ سے تبدیلی کے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اگر یہ حکم معلول بالعلۃ ہے تو اس کی اصل علت کیا ہے؟ بعض اوقات علت کے تعین میں فقہاء کا اختلاف ہوجاتا ہے، ربا الفضل میں علت قدر وجنس؟ یا طعم وثمنیت؟ یا اقتیات وادخار ہے: یہ مختلف علتیں بیان کی گئی ہیں تو اس میں کوئی ایک علت متعین کرنی پڑے گی۔ اس موقع پر ایک غلطی یہ بھی ہوتی ہے کہ علت اور حکمت میں فرق نہیں کیا جاتا، مثال کے طور پر: شراب پینے کی حرمت کی علت مشروب کا خمر (شراب) ہونا ہے اور انسان کو ایسی چیز سے بچانا کہ جو اس کی عقل کو ختم کردے یہ حکمت ہے؛ اب اگر کسی زمانے میں شراب پینے سے لوگوں کی عقل زائل نہیں ہوتی ہے تو حرمت کا حکم ان کے حق میں ختم نہیں ہوگا؛ کیونکہ حکم کی علت یعنی مشروب کا خمر ہونا موجود ہے، خمر کا ساتر عقل ہونا حکمت ہے۔ حکم کا دارومدار اپنی علت پر ہوتا ہے، حکمت پر نہیں، یا جیسے نماز میں قصر کی علت ''سفر'' ہے اور اس کی حکمت ''مشقت'' سے بچانا ہے۔ ہوائی جہاز اور ٹرین کے اے سی ڈبے میں ظاہر ہے مشقت نہیں ہوتی، اس کے باوجود حکم میں تبدیلی نہیں ہوگی، اور اس کے برعکس اپنے ہی شہر یا وطن میں کوئی سخت مشقت پیش آجائے تو نماز میں قصر کرنا جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ یہاں ''علت قصر'' سفر موجود نہیں ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ منصوص حکم کی اصل علت کے بجائے احوال زمانہ کو علت سمجھ لیا جاتا ہے، ایسے موقع پر یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ عرف کی وجہ سے وہ علت زائل ہورہی ہے یا نہیں؟ اگر علت زائل نہیں ہورہی ہے اور اس کے زوال کا فیصلہ کردیا جائے تو یہ غلط ہے۔ جیسے کھیت سیراب کرنے کے لئے پانی کی بیع جائز نہیں ہے، اور جائز نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ پانی کی مقدار مجہول ہے۔ اب اگر زمانہ کے تغیر سے اس میں ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ آلات کے ذریعہ وہ جہالت

مرتفع ہوجائے۔مثلاً آج میٹر سے پانی کی مقدار معلوم ہوجاتی ہے،اس صورت میں چوں کہ علت واقعتاً بدل گئی پس حکم بھی بدل جائے گا اور بیع بھی جائز ہوجائے گی۔

احوالِ زمانہ سے متعلق چند قواعد:

فقہاء احناف نے احوالِ زمانہ اور ضروریات انسان سے تعلق رکھنے والے ایسے فقہی قواعد بھی مرتب کیے ہیں جن کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کے استخراج میں آسانی ہوتی ہے۔

(۱) الضرر یزال، (۲) الضرورات تبیح المحظورات، (۳) الحاجة تنزل منزل الضرورة، (۴) العادة محکمة (۵) المعروف عرفا کالمشروط شرعاً وغیرہ، احوالِ زمانہ کی رعایت کے لیے ہی بنائے گئے ہیں،علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

فلا بد للمفتي والقاضي بل والمجتهد من معرفة أحوال الناس وقد قالوا من جهل بأهل زمانه فهو جاهل. (شرح عقود رسم المفتی ص:۱۱۶)

آج سود کی صورتِ حال اتنی سادہ نہیں رہی جتنی قرونِ اولیٰ میں تھی،سود کی صورتیں اِس قدر متنوع ہوچکی ہیں کہ انسان کا اس سے بچنا تقریباً ناممکن ہوچکا ہے،نکاح وطلاق کے نئے پیش آمدہ مسائل،حرمتِ مصاہرت کی تفصیلات،خرید وفروخت کے جدید مسائل،بینک کا تمام شعبہ ہائے زندگی میں دخیل ہونا، انشورنس کے مسائل، قیمتوں کے نرخ مقرر کرنے کا مسئلہ، اسٹاک ایکسچینج اور حصص کی خرید وفروخت،مشارکہ ومضاربہ اور مرابحہ واجارہ کے جدید مسائل وغیرہ کا انبار ہے،احوالِ زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے آج کے حالات کے تقاضے کے مطابق ان کا شرعی حل پیش کرنا ازبس ضروری ہے؛لیکن اس کے لیے مذکورہ بالا حدود وقیود کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

مطالعہ کے لیے چند کتابیں:

(۱) رسائل ابن عابدین محمد امین بن عمر المعروف ب ''ابن عابدین'' (م:۱۲۵۲ھ) مکتبہ زکریا،دیوبند

(۲) مکانة العرف والعادة فی التشریع الإسلامی، مفتی شعیب اللہ خان صاحب فیصل پبلیکیشنز،دیوبند

(۳) تغَيُّرُ الأحكام في الشريعة الإسلامية، الدکتور اسماعیل کوکسال موسسۃ الرسالۃ،بیروت

(۴) فتوی-تعارف،اصول،آداب، مولانا محمد منصور احمد ادارہ اسلامیات،کراچی

(۵) الاشباہ والنظائر، ابن نجیم المصری (م:۹۷۰ھ) زکریا بک ڈپو،دیوبند

(۶) آپ فتویٰ کیسے دیں؟ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری،مکتبہ حجاز،دیوبند

(۷) عرف وعادت،مجموعہ مقالات سمینار فقہ اکیڈمی،مورخہ ۲۰۱۳ء،ایفا پبلیکیشنز،دہلی

(۸) جدید فقہی مسائل (مقدمہ جلد اول)،مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب،نعیمیہ بک ڈپو،دیوبند

(۹) فقہی مقالات جلد (۵)،مفتی محمد تقی عثمانی صاحب،میمن اسلامی پبلیشرز،کراچی

(۱۰) شریعت میں عرف کا اعتبار اور اس کے حدود وقیود،مفتی محمد مصعب صاحب،مکتبہ النور،دیوبند

☆☆☆

❑ فقہیات (آخری قسط)

اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ پرتاپ گڑھ

اہل کتاب سے سماجی تعلقات کی شرعی حیثیت؟: عیسائی مشنریز کے اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعلیم کا شرعی حکم:

وہ (عیسائی مشنریز کے) اسکول جہاں اس بات کا قوی اور یقینی امکان ہو کہ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم طلباء اور طالبات الحاد ودہریت کا شکار ہو جائیں گے، اور ان کے ذہنوں میں اسلام کے تئیں شکوک وشبہات کے کانٹے جڑ پکڑ لیں گے اور وہ مسلمان صرف نام کے رہ جائیں گے، میری رائے میں ایسے اسکولوں اور اداروں میں مسلمان سرپرستوں کا اپنی اولاد کو تعلیم دلانا شرعاً درست نہیں ہوگا، اور مسلمانوں کا اپنے علاقہ میں جہاں خاص طور پر ان کی اکثریت ہے ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی کرنا، ان کے لئے زمین فراہم کرنا خواہ قیمتہ ہو یا ھدیۃ ناجائز ہے، محض اس لئے کہ ان کے بچے عصری تعلیم سے آراستہ ہو جائیں اور ان کو روز گار کے مواقع حاصل ہو جائیں، مسلمانوں کو اس سے ہر حال میں اجتناب کرنا چاہیے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرمایا کرتے تھے اور اس راقم اثم نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے ''کہ وہ تعلیم جس سے خدا بیزاری آئے الحاد اور دہریت آئے، اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوں اس سے ہزار گنا بلکہ لاکھ گنا بہتر وہ جہالت ہے جس جہالت کے باوجود انسان توحید پرست رہے اس کے اندر خوف خدا رہے اور وہ اللہ کا مطیع اور فرماں بردار بندہ بنا رہے''۔

لہذا ایسے علاقوں میں مسلمانوں پر خاص طور پر اہل ثروت اور متمول حضرات پر ضروری ہے کہ وہ متبادل معیاری تعلیمی درس گاہوں کو قائم کریں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو وہ عنداللہ مأخوذ ہوں گے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ رحمۃ اللہ ان حالات میں ایسے اداروں کے قیام پر زور دیا کرتے تھے۔ آج سے تقریبا ۳۵ سال قبل انھوں نے مدھیہ پردیش میں ایک جلسہ میں فرمایا تھا:

''مانٹیسری اسکول، نرسری اسکول، کنڈر گارٹن وغیرہ قسم کے مدارس نہایت ضروری ہو گئے ہیں، ہم مسلمانوں کو توجہ دلائیں گے کہ اب صرف کنویں بنانا اور صرف مسجد کے مقابلے میں مسجد بنانا صرف یہی ایک نیکی کا کام نہیں ہے، بلکہ بڑی نیکی کا کام یہ ہے کہ آپ اس نئی نسل کو بچائیں اور ایسے معیاری اسکول قائم کریں جن کا انتظام، جن کے اساتذہ کی سطح یعنی کو الیفکیشن، ان کا تجربہ کسی طرح ان دوسرے اسکولوں سے کم نہ ہو، جو دوسرے فرقوں نے قائم کئے ہیں، بلکہ بہتر ہونا چاہیے، مسلمانوں کو ہر میدان میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور پھر ان کا ڈسپلن، رکھ رکھاؤ، اس کی صفائی اور اس کا نظم ونسق وہ ہر طرح سے ایسا ہو کہ کھاتے پیتے لوگ اور جن کا

معیار زندگی بلند ہے، وہ اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں، آپ سب جانتے ہیں کہ میں مدرسہ کا آدمی ہوں، اب بھی مدرسہ کا خادم ہوں اور عربی مدارس کی دعوت دیتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ میں ہی آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اب آپ زمانہ کو سمجھئے، زمانہ کے تیور کو سمجھئے اور آپ ہر جگہ ایسے اسکول قائم کیجئے، جہاں اچھے خوشحال اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے بچوں کو بے تکلف بھیجیں، آپ یہ امید نہ رکھیں کہ سب عربی مدارس میں آجائیں گے، یہ ہوجاتا تو بڑا اچھا تھا، لیکن ہر تمنا پوری نہیں ہوتی ہے، اس کا ہمیں لحاظ رکھنا چاہیے کہ ایسا نہیں ہو سکے گا،.....ان کے لئے ایسے اسکولوں کو قائم کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے کہ جہاں بقدر ضرورت دینیات سے واقفیت ہوجائے، نماز اور روزے کے پابند ہوجائیں، اردو پڑھ لکھ سکیں، اور اسلام کی خوبی کا نقش ان پر قائم ہوجائے، وہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کریں اور اس کی کوشش کریں کہ مسلمان رہیں۔ اور پھر دوسرے یہ بھی ایک نظام ہی ہے کہ ان میں وہ نہ صرف یہ کہ ان کے برابر تیار ہوں جو غیر مسلم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، بلکہ آپ کا تعلیمی نتیجہ ان سے بہتر ہوجانا چاہیے، آپ کے بچے جب وہاں جائیں چھٹے میں یا اوپر ہائی اسکول وغیرہ میں داخل ہوں تو وہ ان کے مقابلہ میں بہتر ہوں، اگر آپ اس میں کامیاب ہوئے تو بڑی خدمت انجام دیں گے اور کبھی یہ نہ سمجھئے گا کہ آپ کوئی غلط کام کر رہے ہیں، کوئی صاحب اگر آپ کو اس میں وسوسہ پیدا کردیں کہ میاں! کہاں کس جھنجھٹ میں پڑے ہو، سیدھے سیدھے ایک سرائے بناؤ، جہاں مسافر ٹھہریں، یا کسی لنگر کا انتظام کرو، یا مسجد میں ایک اور منارہ بنادو، دو منارے ہیں اس میں ایک اور منارہ بن جائے، تو آپ کبھی ایسے آدمیوں کی بات میں نہ آیئے گا، ہم بھی دین کا تھوڑا علم رکھتے ہیں، خدا کے فضل سے دینی مدارس ہی کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور بس چلے تو آپ سب بھی اس کے لئے مدد کریں اور اپیل کریں، لیکن آپ جو کام کر رہے ہیں اس کو ہم سراہتے ہیں، ہم اس کی قدر کرتے ہیں اور ہم خود اس کی ضرورت سمجھتے ہیں''۔ (بحوالہ: تحفۂ انسانیت یا حدیث مالوہ صفحہ: ۸۳-۸۴)

کتابیہ عورت اگر مسلمان کی زوجیت میں ہو تو اس کے حقوق کیا ہوں گے ؟:

(ب) کتابیہ عورت اگر کسی مسلمان کی زوجیت میں ہو تو اس کے بھی (نان، نفقہ اور سکنی) وہی حقوق ہوں گے، جو مسلمان بیویوں کے ہیں۔ اس میں مسلمان بیوی اور کتابیہ میں کوئی فرق نہیں ہے، مجموعۂ قوانینِ اسلامی دفعہ ۱۶۳ میں لکھا ہے۔ ''اس لئے بیوی مسلمان ہو یا کتابیہ، امیر ہو یا غریب تندرست ہو یا بیمار اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے'' (البحر الرائق: باب النفقہ) (مجموعہ قوانین اسلامی صفحہ: ۱۲۷-۱۲۸)

کتابیہ عورت سے نکاح کرنے کے بعد محض ان کے حقوق سے راہ اختیار کرنے اور ان کو چھوڑ کر بھاگ آنے یا محض کتابیہ عورت سے نکاح کرنے کے بعد محض غیر مسلم ہونے کی بنیاد پر طلاق دے دینے کی اجازت میری نظر میں شریعت کے مزاج کو دیکھتے ہوئے مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی ہوسکتی ہے، اور غیروں تک غلط پیغام جا سکتا ہے، ممکن ہے، لڑکی والے عدالتی چارہ جوئی کریں اور اس بہانے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کریں، اور یہ ایک طرح سے وعدہ خلافی بھی ہے اور اسلام وفائے عہد کی بھرپور تلقین کرتا ہے، بلکہ ایسے شوہر کو تو اپنے اخلاق و کردار کو اتنا اعلیٰ بنانا چاہیے کہ وہ بیوی اس سے متاثر ہوکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوجائے اور ہمہ وقت اس کے قبول اسلام کے لئے دعا بھی کرتا رہے (وما ذلک علی اللہ بعزیز)۔

ہاں اگر اس کتابیہ بیوی سے اس کو اور اس کی اولاد کو ایمان اور عقیدے کے بگڑ جانے کا خطرہ ہو اور یہ خطرہ یقینی ہو نیز یہ اندیشہ ہو کہ یہ عورت اس کی اولاد کو عیسائی بنا دے گی تو پھر اس صورت میں الاسلام یعلو ولا یعلی علیه کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی عورت سے راہِ نجات حاصل کرنا اور اس کو چھوڑ کر اور طلاق دے کر اپنی اولاد کو ساتھ لے کر اپنے سابقہ ملک آجانا یہ عین اسلامی طریقہ اور راستہ ہوگا اس میں کسی طرح کی کوئی کراہت نہیں ہونی چاہیے۔ اسی بنا اور خدشہ پر حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی کتابیہ بیوی کو طلاق دے دیں۔ اور اس کی متعدد مثالیں بھی کتبِ تاریخ میں موجود ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

کیا کتابیہ عورت اپنے شوہر کے گھر مذہبی مراسم انجام دے سکتی ہے؟: وہ اہل کتاب خواتین جو مسلمان مردوں کے نکاح میں ہیں وہ اپنے شوہر کے گھر میں مذہبی مراسم انجام دے سکتی ہیں، مذہبی مراسم کی ادائیگی کے لئے وہ کنیسہ نہیں جاسکتی ہے۔ ہاں اگر شوہر سے اس کے لئے اجازت لے اور شوہر اجازت دے دے تو جانے کی گنجائش ہے، کتابیہ عورت اپنے مذہبی مراسم کو صرف اس حد تک انجام دے سکتی ہے جس سے کہ ان کی اولاد پر عیسائیت اور یہودیت کا رنگ نہ چڑھنے پائے اور وہ اپنے شوہر کے گھر میں صلیب اور مجسمہ نہیں لگا سکتی ہے اور نہ ہی ناقوس بنا سکتی ہے اور نہ ہی کرسمس ڈے وغیرہ منا سکتی ہے اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کا یوم ولادت منا سکتی ہے۔ اگر کتابیہ عورت اپنے مسلمان شوہر کے گھر میں ان مذکورہ چیزوں سے ہٹ کر اپنے مذہبی مراسم ادا کرتی ہے تو اس کے شوہر کو حق نہیں ہے کہ وہ اس کو اس سے منع کرے اور اسی طرح شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسکو اسلام لانے پر مجبور کرے کیوں کہ قرآن صاف کہتا ہے لا اکراہ فی الدین البتہ حکمت اور ترغیب کے ذریعہ وہ اس کو اسلام سے قریب کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں ہے، بلکہ یہ خیر والا عمل ہوگا۔

اب اخیر میں اس مسئلہ پر ایک عرب عالمِ دین ومفتی کا فتوی نقل کرتے ہیں اور ساتھ ہی استفتا بھی تا کہ اس مسئلہ کی اچھی طرح وضاحت ہوجائے اور مسئلہ کا مالہ وماعلیہ بالکل سامنے آجائے:

السوال: لما ذا لا يسمح للفتاة الكاتوليكية المتزوجة من مسلم الإحتفال بأعيادها الدينية؟ مع انها متزوجة من مسلم وهى باقية على عقيدتها، هل يمكنها أن تتعبد حسب إعتقادها؟

الجواب: اذا رضيت الفتاة النصرانية بالزواج من مسلم، فانه ينبغى أن يتعلم أمورا:

(١) أن الزوجة مأمورة بطاعة زوجها، فى غير المعصية، لا فرق فى ذلك بين الزوجة المسلمة وغيرها. فاذا امرها زوجها بغير معصية لزمها طاعتها، وقد جعل الله هذا الحق للرجل، لأنه قوام على الأسرة ومسئول عنها، ولا يستقيم الحياة الأسرية إلا بأن تكون هناك كلمة مسموعة مطالبة من فرد من أفرادها، لكن هذا لا يعنى أن يتسلط الرجل ويستغل هذا الحق للإساءة إلى زوجته وأولاده، بل يجتهد فى الصلاح والإصلاح والنصح والتشاور، لكن لا تخلو الحياة من مواقف تحتاج إلى حسم وكلمة فاصلة، لا بد منها، ومن الإستجابة لها، فينبغى للفتاة النصرانية أن تتفهم هذا المبدأ قبل اقدامها على الزواج من مسلم.

(۲) إن اباحة الإسلام الزواج من نصرانية أو يهودية يعنى الزواج بها مع بقائها على دينها فليس للزوج أن يكرهها على الإسلام وأن لا يمنع من عبادتها الخاصة بها، لكن له الحق فى منعها من الخروج من المنزل، كنصب التماثيل، وضرب الناقوس، ومن ذلك:

الإحتفال بالأعياد والمتبدعة، كعيد قيامة المسيح، لأن ذلك منكر فى الإسلام، من جهتين:

من جهة كونه بدعة لا أصل لها، مثله الإحتفال بمولد الرسول ﷺ أو بعيد الأم، ومن جهة ما يتضمنه من الإعتقاد الفاسد من أن المسيح قتل وصلب وأدخل القبر ثم قام منه، والحق أن عيسى عليه السلام لم يقتل ولم يصلب وانما رفع إلى السماء حياً (النظر السوال ١٠٢٧٧، ٤٣١٨٦)

(ج) عیسائی رفاہی اداروں میں مسلمانوں کی ملازمت: عیسائی مشنریز کے وہ ادارے (مثلا ہاسپٹل، ہاسٹل، بینک وغیرہ) جو خدمت خلق کے ساتھ عیسائیت کی منصوبہ بند تبلیغ کرتے ہیں یا کم از کم مسلمانوں کو ان کے مذہب سے دور کردینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ایسے اداروں میں مسلمانوں کا بحیثیت ملازم اور کارکن خدمت کرنا اور تنخواہ لینا از روئے شرع جائز نہ ہوگا، اور نہ ہی بلا شدید مجبوری اور ضرورت کے ان اداروں سے استفادہ کرنا جائز ہوگا، کیوں کہ یہ عمل دراصل عیسائیت کے فروغ کا ذریعہ ہوگا، اور یہ تعانوا على البر والتقوى کے برعکس تعاونوا على الاثم والعدوان کے مترادف ہوگا۔

البتہ الضرورات تبيح المحظورات کے قاعدہ کو سامنے رکھتے ہوئے نیز المشقة تجلب التيسير کے ضابطے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایسے شخص کے لئے جو معاشی اعتبار سے بالکل مفلوج ہو کوئی دوسری ملازمت اور ذریعہ معاش حاصل نہ ہو اور ایسے اداروں میں ملازمت ترک کردے تو فاقہ کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اس میں ملازمت کرسکتا ہے، لیکن اس ملازمت سے دل میں کراہت محسوس کرے اور جب تک متبادل نہ ہوجائے، ایک مجبوری کے طور پر کرتا رہے، اس لئے کہ اگر وہ اس ادارہ کی ملازمت بہ یک قلم ترک کرے گا اور کوئی دوسری صورت سامنے نہ ہوگی، تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ فقر و فاقہ اور افلاس اس کو کسی اور گناہ میں مبتلا کردے، کیوں کہ حدیث میں آتا ہے كاد الفقر أن يكون كفرا۔

لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہ رعایت صرف ان لوگوں کے لئے ہوگی جو اقتصادی اعتبار سے بالکل مجبور و بے بس ہوں نہ یہ کہ تعیش اور راحت طلبی اس ملازمت سے مقصود ہو۔

جہاں تک مسلمانوں کا ان اداروں سے استفادہ کا سوال ہے تو بلا شدید مجبوری اور ضرورت کے عیسائی مشنریز کے ہاسپٹل اور بینکوں سے فائدہ اٹھانا مسلمان کے لئے جائز نہ ہوگا کیوں کہ یہ خطرہ بہرحال ہے کہ کہیں مادیت کا لالچ دلا کر وہ عیسائیت کی طرف راغب نہ کریں، اور مسلمانوں کو اسلام سے دور کرکے برائے نام کا مسلمان نہ بنادیں۔

ایسے علاقوں میں وہاں صاحبِ ثروت مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے لئے رفاہی، طبی اور مالیاتی ادارے قائم کریں اور اس کے لئے وہاں کے مسلمان سر جوڑ کر بیٹھیں۔ یا ایسے علاقوں کے مسلمان ان کی مدد کریں تاکہ وہ اپنا علاج و معالجہ کرسکیں، اور کوئی ذریعہ معاش تجارت کی شکل میں نکال سکیں، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

❑ فقہیات

مالی جرمانہ شریعت کی روشنی میں

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی
استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام، عمرآباد

اسلامی شریعت نے جرائم اور کوتاہیوں کے سد باب کے لئے سزاؤں کا ایک نظام بنایا ہے، جس کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک حدود جن کا متعین جرائم سے تعلق ہے، خود خالق کائنات نے جرائم کے لحاظ سے سزاؤں کی تحدید فرمادی ہے، اس میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے، حدود وقصاص کی تنفیذ اسلامی حکومتوں میں ہی قابل عمل ہے، جہاں کے احکام اور دستور خالص کتاب وسنت کی روشنی میں طئے کئے گئے ہوں۔ دوسرا حصہ تعزیر جس کا تعلق ہر اس ناپسندیدہ امر سے ہے جس میں تنبیہ کی ضرورت محسوس کی جائے، قاضی وقت یا بااختیار جماعت کوئی سزا متعین کرتی ہے،، خواہ سزا جسمانی تنبیہ کی شکل میں ہو یا زبانی فہمائش ہو۔ تعزیرات کی تنفیذ کے لئے اسلامی حکومت وسلطنت شرط نہیں ہے، بلکہ اسلامی معاشرہ، اسلامی جمعیتیں/ بااختیار وبا اقتدار جماعتیں/ عدالتیں/ دار القضاء/ امارات شرعیہ وغیرہ حالات اور ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر قانون کے دائرہ میں رہ کر عدل وانصاف کے تقاضوں کے ساتھ مناسب تعزیرات لاگو کرسکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ممالک میں صرف حکومت ہی جسمانی تعزیر کرسکتی ہے، سماجی طور پر جرائم کو روکنے کے لئے ایسی تعزیر نافذ کرنا ممکن نہیں ہے، ایسے حالات میں تعزیر مالی کے مسئلہ پر غور کیا جائے اور غور کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی تعلیمات، فقہاء کے اجتہادات اور موجودہ حالات کو پیش نظر رکھا جائے، تاکہ جرائم کا سد باب ممکن ہوسکے، گھر، محلّہ، خاندان اور معاشرہ پرسکون ہو، لہٰذا اس پس منظر میں چند سوالات مع جوابات پیش خدمت ہیں:

۱- تعزیر بالمال کا مفہوم کیا ہے؟ فقہاء کے یہاں کچھ اس قسم کی بات ملتی ہے کہ ایک ''تعزیر بالمال'' ہے اور ایک ''تعزیراً خذ المال''، ان دونوں میں کیا فرق کیا گیا ہے؟

جواب: شریعت کی اصطلاح میں تعزیر یہ ہے کہ ایسی معصیت پر ادب دینا جس میں حد یا کفارہ نہ ہو۔

تعزیر بالمال کا مطلب یہ ہے کہ کسی جرم کی سزا کے طور پر مجرم پر مالی تاوان لاگو کیا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ مالی تاوان/ ہرجانہ ادا کرے، جب کہ تعزیر باخذ المال کا مطلب یہ ہے کہ والی یا قاضی یا حاکم ظالم کا مال لے لے اور اسے یا تو بیت المال میں ایک وقت مقرر تک محفوظ رکھے یا مصلحت کی بنیاد پر اس مال کو حاصل کرنے کے بعد ضائع کردے۔

د/ وہبہ الزحیلی نے فرمایا ہے کہ **ومعنى التعزير بأخذ المال على القول عند من يجيزه ، هو امساك شيء من مال الجاني عنه مدة لينزجر عما اقترفه ،**

ثم یعیدہ الحاکم الیه ، لا أن یأخذہ الحاکم لنفسه ، أو لبیت المال ، کما یتوهمه الظلمة ، اذ لایجوز لاحد من المسلمین أخذ مال احد بغیر سبب شرعی ، وقال ابن عابدین . وأری أن یاخذ الحاکم مال الجانی ، فیمسکه عنده ، فان أیس من توبته ویصرفه الی مایری من المصلحة. ((الفقه الاسلامی وادلته ، د/وهبة الزحیلی،۷/۵۱۸)

’’تعزیر باخذ المال کا مطلب یہ ہے کہ حاکم وقت کچھ مدت کے لئے ظالم کے مال میں سے کچھ حصہ روک لے، تاکہ ظالم اپنے جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وقت اس مال کو مستقل اپنے پاس رکھنے کے بجائے ظالم کے پاس واپس لوٹا دے، یا بیت المال کے حوالہ کردے، کیونکہ شرعا کسی کو کسی کا مال بغیر کسی سبب شرعی کے قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ نیز ابن عابدین کا قول یہ ہے کہ میری رائے یہ ہے کہ حاکم وقت ظالم کے مال کو حاصل کرلے اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھے، اگر حاکم ظالم کے توبہ سے مایوس ہوجائے تو اسے اختیار ہے کہ جہاں مصلحت کا تقاضہ ہوخرچ کرے‘‘۔

۲- تعزیر بالمال کی بابت علماء اسلام اور ائمہ مجتہدین کی رائے کیا ہے؟

حنفیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ مال لے کر کسی کی تعزیر (کسی کو مالی سزا دینا) جائز نہیں ہے چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ تعزیر بالمال کی اجازت نہیں دیتے۔ قال فی البحر الرائق ، ولم یذکر محمد التعزیر باخذ المال (۵/۴۴) فی شرح الاثار ،التعزیر بالمال کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ ، والحاصل ان المذهب عدم التعزیر باخذ المال (رد المحتار ،۵ ۱/۸، ابن عابدین۳/۱۸۴، البدائع ، ۷/۶۳، فتح القدیر ۴/۲۱۲، تبیین الحقائق ،۳/ ۲۰۷ ، المغنی ،۸/۳۲۴، اعلام الموقعین ،۲/۹) امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر مصلحت کی رعایت کی جائے تو مجرم سے مال لے کر تعزیر کرنا جائز ہے۔ (ابن عابدین۳/۱۸۴۔ الزیلعی ۳/ ۲۰۸۔فتاوی بزاریہ ۲/ ۴۵۷)

البحرالرائق میں منقول ہے کہ سمعت عن ثقاتان التعزیر باخذالمال ان رأی القاضی ذلک أو الوالی جازومن جملة ذلک رجل لا یحضر الجماعة یجوز تعزیرہ باخذ المال (البحر الرائق, ۵ /۴۴) یعنی میں نے قابل اعتماد لوگوں سے سنا ہے کہ تعزیر باخذ المال قاضی یا والی یا گورنر کی رائے اور ان کی مصلحت کے ساتھ مربوط ہے ،مثال کے طور پر کوئی شخص جماعت کی نماز میں حاضر نہ ہوتو قاضی یا والی کو اس کے مال پر قبضہ کرنے اور تصرف سے روکنے کا حق ہوگا۔

وقد روی عن ابی یوسفؒ أن التعزیر من السلطان باخذالمال جائز کذا فی الظهیریة (البحر الرائق، ۵ /۴۴) یعنی امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ سلطان یا حاکم وقت کو تعزیر باخذ لمال کی اجازت ہے، یہی رائے ظہیریہ میں منقول ہے۔ وفی البزاریة ,ان معنی التعزیر بأخذالمال هو امساک شیء من ماله مدة عنده لینزجر ثم یعید الحاکم الیه لا ان یاخذه الحاکم لنفسه او لبیت المال کما یتوهمه الظلمة ,اذ لا یجوز لاحدمن المسلمین اخذ مال احدبغیر سبب شرعی.(البحر الرائق, ۵/۴۴)

بزاریہ میں (یہ فتوی منقول) ہے کہ حاکم وقت کچھ مدت کے لئے ظالم کے مال میں سے کچھ حصہ روک لے، تاکہ ظالم

اپنے جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وقت اس مال کو مستقل اپنے پاس رکھنے کے بجائے ظالم کے پاس واپس لوٹا دے، یا بیت المال کے حوالہ کردے، کیونکہ شرعاً کسی کو کسی کا مال بغیر کسی سبب شرعی کے قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وقال ابن عابدین . وأری أن یاخذ الحکم مال الجانی ، فیمسکه عنده ، فان أیس من توبته و یصرفه الی مایری من المصلحة.((الفقه الاسلامی وادلته ، د/وهبة الزحیلی،۷/۵۱۸)

نیز ابن عابدین کا قول یہ ہے کہ میری رائے یہ ہے کہ حاکمِ وقت ظالم کے مال کو حاصل کرلے اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھے، اگر حاکم ظالم کے توبہ سے مایوس ہوجائے تو اسے اختیار ہے کہ جہاں مصلحت کا تقاضہ ہو خرچ کرے۔ و عن الطرسوسی , أن مصادرة السلطان لأرباب الاموال لا تجوز الا لعمال بیت المال ,أی اذا کان یردها لبیت المال (۱۵/۲۰۸) طرسوسی کا خیال یہ ہے کہ مال پر قبضہ کرنا صرف بیت المال کے کارندوں کے لئے ہی جائز ہے، جب کہ وہ مال کو بیت المال میں جمع کرتے ہوں۔

۳- علماء اسلام اور ائمہ ثلاثہ کے فقہاء کے اقوال اس بابت کیا ہیں؟ کیا ان مذاہب میں اس بابت کچھ گنجائش منقول ہے؟

تعزیر بالمال کے تعلق سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ التعزیر بالعقوبات المالیة مشروع أیضا فی مواضع مخصوصة فی مذهب مالکؒ فی المشهور عنه ، و مذهب أحمدؒ فی مواضع بلانزاع عنه ،و فی مواضع فیها تزاع عنه، والشافعیؒ فی قول وان تنازعوا فی تفصیل ذلک کما دلت علیه سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مثل اباحته سلب الذی یصطاد فی حرم المدینة لمن وجده ومثل امره بکسر دنان الخمر وشق ظروفه ومثل امره عبد الله بن عمرؓ بحرق الثوبین المعصفرین وقال له اغسلهما ؟ قال لا بل احرقهما،(الحسبة ،ص ۲۵)

یعنی تعزیر مالی مخصوص مقامات میں امام مالکؒ کے مشہور مسلک کے مطابق شرعاً اس کی اجازت ہے، نیز امام احمدؒ کے پاس بعض حالات میں بلا اختلاف اور بعض حالات میں اختلاف کے ساتھ تعزیر مالی کی اجازت ہے، نیز امام شافعیؒ کے پاس ایک قول کے مطابق تعزیر مالی مشروع ہے، اگر چہ کہ ارباب فقہ وفتاوی کے تفصیلی مباحث میں اختلافات درج کئے گئے ہیں، شیخ الاسلامؒ نے اس امر کی مشروعیت پر مصدر ثانی سنت رسول ﷺ سے بے شمار دلائل سے ثابت کیا ہے مثال کے طور پر حرم مدنی میں شکار کرنے والے کے مال ومتاع کے چھین لینے کا جواز، شراب کے پیالوں اور برتنوں کے توڑنے کے احکامات، نیز آپ ﷺ کا عبداللہ ابن عمرؓ کو دو زرد کپڑوں کے جلادینے کا حکم صادر فرمانا جب کہ انہوں نے رنگ دھونے کے تعلق سے استفسار کیا تو ارشاد ہوا کہ نہیں ان کپڑوں کو جلا ہی دو، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا حکم کہ مسجد ضرار کو ڈھادیا جائے، مانعینِ زکوۃ سے ان کا نصف مال جرمانہ کے طور پر لیا جائے، خلفاء راشدین میں حضرت عمرؓ وعلیؓ کا شراب کے اڈوں اور دکانوں کو جلانے کا حکم، نیز حضرت عمرؓ کا گزشتہ آسمانی کتابوں کو جلادینا، اور جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے رعایا سے الگ تھلگ رہنے کی خاطر اپنے لئے خاص محل تعمیر فرمائے تو امیر المومنین عمر فاروقؓ نے اس محل کو جلانے اور خاکستر کرنے کا حکم صادر فرمایا، جب کہ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور میں ان تمام مصاحف کے نسخوں کو

جلادینے کا حکم صادر فرمایا جو مصحفِ امام کے خلاف ہو، شیخ الاسلامؒ نے آگے چل کر یہ بھی فرمایا کہ وهذه القضايا كلها صحيحة معروفة عند اهل العلم بذلک ونظائرها متعددة، ومن قال ان العقوبات المالية منسوخة واطلق ذلک عن اصحاب مالک و احمد فقد غلط على مذهبهما و من قاله مطلقا من أى مذهب فقد قال قولا بلادليل ولم يجئ عن النبى عليه السلام شيئ قط انه حرم جميع العقوبات المالية بل اخذ الخلفاء الراشدون واكابر اصحابه بذلک بعد موته دليل على ان ذلک محكم غير منسوخ وعامة هذه الصور منصوصة عن احمد ومالک واصحابه وبعضها قول عند الشافعي باعتبار ما بلغه من الحديث ومذهب مالک واحمد وغيرهما ان العقوبات المالية كالبدنية تنقسم الى ما يوافق الشرع الى ما يخالفه وليست العقوبة المالية منسوخة عندهما والمدعون للنسخ ليس معهم حجة بالنسخ لا من كتاب و لا من سنة وهذا شان كثير ممن يخالف النصوص الصحيحة والسنة بلا حجة(الحسبة لشيخ الاسلام ابن تيمية، ص ۲۶)

مذکورہ ساری مثالیں صحیح سندوں سے ثابت ہیں اور اہل علم کے نزدیک مشہور ومعروف ہیں، اس کی نظیریں متعدد ہیں، البتہ جن حضرات نے تعزیر مالی کے منسوخ ہونے کا دعوی کیا ہے اور مطلقا امام مالک وامام احمد کے اصحاب کی طرف منسوخ ہونے کا قول منسوب کیا ہے، یقیناً ان کے مسلک میں قول کے انتساب میں غلطی کی ہے، اور جس نے کسی بھی مکتبِ فکر کے تعلق سے مطلقا یہ کہا کہ مالی تعزیر فلاں مسلک میں جائز نہیں ہے یقیناً اس کا یہ قول بلا دلیل ہے، نبی کریم ﷺ سے کوئی حکم ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے تعزیرات مالیہ کو حرام قرار دیا ہو، بلکہ خلفاء راشدین اور اکابر صحابہؓ نے آپ کی سنتوں سے یہی حکم مستنبط فرمایا کہ یہ حکم محکم ہے اور غیر منسوخ ہے، نیز یہ تمام صورتیں امام احمدؒ وامام مالکؒ اور ان کے اصحاب سے ماخوذ ومنصوص ہیں، بعض جواز سے متعلق اقوال امام شافعیؒ ،امام احمدؒ وامام مالکؒ سے حدیثِ رسول ﷺ کے پہنچنے پر اس طرح منسوب ہیں کہ مالی تاوان کی سزائیں بدنی سزاؤں کی طرح تقسیم شدہ ہیں، یعنی بعض شریعت کے موافق ہیں اور بعض شریعت کے مخالف ہیں، مالی تعزیر امام احمدؒ وامام مالکؒ کے پاس منسوخ نہیں ہے، جن حضرات نے مالی تاوان کے منسوخ ہونے کا دعوی کیا ہے وہ دعوی بلا دلیل ہے، نہ قرآن کریم سے یہ دعوی ثابت ہے اور نہ ہی سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے، یہ خاص کر ان لوگوں کی عادت اور وطیرہ ہے جو نصوص صحیحہ اور سنت رسول ﷺ کی بغیر کسی دلیل کے مخالفت کرتے ہیں۔

علامہ شبراملسی فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے جدید مسلک میں مالی جرمانہ جائز نہیں ہے، اور قدیم مسلک میں جائز ہے۔ (حاشية الشبراملسي على شرح المنهاج ۷/۱۷۴/الحسبه ,ص ۴۰)

امام مالکؒ کا مشہور قول جیسا کہ ابن فرحون فرماتے ہیں کہ تعزیر بالمال جائز ہے۔(الحسبه,ص ۴۰/تبصرة الحكام /۷/۳۶۷,۳۶۸)

حنابلہ کے نزدیک پاس مال لے کر یا اسے تلف کر کے تعزیر کرنا حرام ہے، اس لئے کہ جس کی اقتداء ہوسکتی ہے ان سے اس کے سلسلہ میں شریعت میں کوئی چیز نہیں آئی ہے (الموسوعة الفقهية الكويتيه ۱۲/۳۱۳)

۴- ایسے حالات میں جبکہ جرائم ومعاصی سے روکنے کے لئے وعظ اور زبانی فہمائش کافی نہ ہو اور جسمانی سزا کا بھی کوئی موقع نہ ہو تو کیا ضرورۃً جواز وگنجائش کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے؟ اس بنیاد پر کہ یہ مذہب کا قول ضعیف ہے اور دوسرے مذاہب میں بھی کچھ نہ کچھ جواز وگنجائش کی بات آتی ہے۔ اور ضرورت کے مواقع پر مذہب کے قول ضعیف اور مذہب غیر پر فتوی دینے اور عمل کرنے کے جائز ہونے پر اتفاق ہے۔

جواب: مذکورہ حالات میں اور مذکورہ اسباب اور ضرورت کی بنیاد پر مناسب اور معقول مالی جرمانہ کے جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے, کیونکہ اس موضوع میں سنت سے بے شمار دلائل موجود ہیں، خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ کے فیصلے ثابت ہیں، بلکہ ائمہ کرامؒ سے بھی جواز کے فتوے منقول ہیں، لہذا یہ کوئی ضعیف یا مرجوح قول نہیں ہے کہ اسے قبول کرنے میں تامل سے کام لیا جائے، حق بات یہ ہے کہ اس قول پر عمل درحقیقت عمل بالحدیث الصحیح ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے مالی تاوان کی تین تقسیمیں بیان کی ہیں، **الاتلاف والتغییر والتملیک** ۔یعنی مال کو ضائع کردینا، مال کی شکل وصورت کو تبدیل کردینا، اور کسی کو مالک بنادینا، ان تینوں صورتوں کی مثالیں بھی بیان کی ہیں مثالیں بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

۱) اتلاف کی صورتوں میں سے حضرت عمر فاروق ؓ کا شراب خانوں کی دکانیں یا اس کے کارخانوں کو نیست ونابود کردینا، نیز حضرت علیؓ کا اس قریہ کو جلادینا جہاں شراب بیچی جاتی تھی، اس لئے کہ محل بیع وشراء کو ختم کرنا بھی اسی طرح ہے جس طرح شراب کے برتنوں کو توڑ دینا ہے، نیز حضرت عمرؓ کا پانی ملائے ہوئے دودھ کو زمین پر انڈیل دینا وغیرہ۔

۲) تغییر کی صورتیں: نبی کریم ﷺ کے گھر میں موجود مجسمہ کے سر کو توڑ دیا جانا، پھر اس مجسمہ کا درخت کی طرح نظر آنا، نیز آپ ﷺ کے گھر میں موجود ایک منقش چادر کو چاک کرکے اس سے دو تکیے بنائے گئے تھے۔

۳) التملیک: حضرت عمر فاروقؓ کا دوگنا تاوان کا فیصلہ اس شخص کے حق میں جس نے کسی گمشدہ چیز کو چھپا کر رکھا تھا۔ نیز حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں جب کوئی مسلمان کسی ذمی کو عمداً قتل کردیتا تو اس پر کامل دیت کا حکم صادر فرماتے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۷/ ۵۱۹)

نوٹ۔ مالی تاوان لگانے کے جواز کے لئے مندرجہ ذیل شروط کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے:

۱) جرمانہ کے نام سے استغلال یعنی زیادتی نہ ہو، کسی کی مجبوری کا غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

۲) جرمانہ کی رقم بھی باہم مشورہ سے طے شدہ ہو۔

۳) جرمانہ حداعتدال سے متجاوز نہ ہو، کہ مجرم تاوان ادا ہی نہ کرسکے۔

۴) جرم کے لحاظ سے جرمانہ کی مقدار میں تفاوت ہو، کمی بیشی ہو۔

۵) ہر ایک مجرم کے لئے اس کی قدرت کے مطابق قابل ادا ہو۔

۶) جرمانہ مکلّف کی قوت وطاقت سے متجاوز نہ ہو، ضرورۃ جرمانہ معاف کرنے کی گنجائش بھی ہو۔

۷) جرمانہ کی مقدار کی ادائیگی میں آسانی کا پہلو مقدم ہو، ضرورت پڑنے پر قسط وار ادائیگی کی گنجائش بھی ہو۔

۸) یہ تاوان مستقل طور پر نہ ہو کہ ادارہ اس جرمانہ کو پیسہ کمانے کا ذریعہ نہ بنالے اور ہر چھوٹے جرم کے لئے بطور تاوان بڑی رقم حاصل کرنے کے حیلے بہانہ نہ تلاش کرے،

۹) مالی جرمانہ لینے کے بعد مصلحت عامہ پر ہی خرچ کیا جائے، کسی غریب یا ضرورتمند کی کوئی ضرورت پوری کی جائے۔

۱۰) مالی جرمانہ ادا کرنے کی طاقت نہ ہو تو کسی دوسری سزا

کی بھی کوئی گنجائش باقی رہے۔

۵- تعلیمی اداروں میں طلباء کی مختلف کوتاہیوں اور غفلتوں پر روک لگانے کے لئے نیز دیگر اداروں مثلاً ہاؤزنگ سوسائٹیوں وغیرہ میں بھی نظم ونسق کو بحال رکھنے کی خاطر مالی جرمانہ لگانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: مالی جرمانہ یقیناً شریعت کے ذیلی مصادر مصالح مرسلہ سے متعلق ہے، تعلیمی اداروں میں حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھ کر مناسب مالی جرمانہ لگانے کی صورت میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ مالی جرمانہ کے جواز پر شرعا کئی دلائل اور نظائر موجود ہیں، لہذا مالی جرمانہ یا تاوان لگانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ وہ مناسب اور معقول ہو، جو ارباب حل وعقد کے مشوروں سے طے شدہ ہو، اس لئے کہ شرعا کوئی بھی قانون مکلّف کے طاقت سے بڑھ کر ہو تو جائز نہ ہوگا۔ صورت مسؤلہ میں فریقین کو نقصان سے بچانے کے لئے عہد و پیمان کی پابندی لازم ہے، ارشاد باری تعالی ہے، یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۔(سورۃ المائدہ،۱) اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: المسلمون علی شروطهم ،یعنی مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہوں گے۔ (سنن ابی داؤد،۳۵۹۴،حسن صحیح)

دور حاضر میں ہاؤزنگ سوسائٹیوں وغیرہ کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی یا تاوان کی حیثیت سود کی ہوگی، یعنی کل قرض جر نفعا فهو ربا ۔قرض کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ وصول کرنا گویا سود وصول کرنے کے برابر ہے، لیکن سوسائٹی والوں کو بھی حرج سے بچانے کے لئے کوئی قانون یا عہد و پیمان کا پابند بنایا جائے تا کہ کسی کو کسی بھی صورت میں نقصان وغیرہ نہ ہو۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو نقصان پہنچاؤ: لا ضرر ولا ضرار. (ابن ماجه : ۳۴۰)

۶- برادریاں اور خاندانی پنچایتیں نیز کاروباری انجمنیں بھی دباؤ اور اصلاح کی غرض سے اس قسم کا نظام بناتی ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: مالی تاوان کے جواز پر دلائل جب موجود ہیں تو کسی بھی ادارہ کے نظم وضبط کو مضبوط بنانے کے لئے یا اصلاح احوال کی نیت سے جرمانہ لگانا جائز ہوگا، اور یہ معاملہ مصالح مرسلہ کے قبیل سے ہے، جس میں حالات اور مصلحتوں کی بنیاد پر قوانین بنائے جاسکتے ہیں بشرطیکہ وہ روح شریعت سے متصادم نہ ہوں۔

۷- طلاق کے بارے میں جو افراط وتفریط پائی جاتی ہے اور جس سے بڑی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کو قابو میں کرنے کے لئے کیا بے جا طلاق کی صورت میں متعہ (نفقہ یا خرچ) واجب کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ارشاد باری ہے کہ ومتعوهن علی الموسع قدره وعلی المقتر قدره . (البقرة،) ہاں اُن (مطلقات) کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔

نکاح کے موقع پر مہر کی تعیین شرعا و نصاً حکم وارد ہے مگر اس مہر کے ساتھ طلاق کی صورت میں طے شدہ مہر کے علاوہ مزید نصف مہر لازم کیا جائے مناسب نہیں معلوم ہوتا , کیونکہ عقدِ نکاح کو طلاق پیش آنے سے قبل ہی موہوم طلاق کے ساتھ مربوط و مشروط کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ نکاح مشروط شرعا درست نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ نکاح کے وقت بعض معقول شرطیں لگانا صحیح ہے، جنہیں نکاح بالشرط کہا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد

نبوی ﷺ ہے احق الشروط ان توفوا به ما استحللتم به الفروج (صحیح البخاری، ۲۷۲۱) یعنی سب سے زیادہ وفا کا حق رکھنے والی وہ شرط ہے جس کے ذریعہ سے تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفیہ کے پاس ہر مطلقہ کے لئے متعہ مستحب ہے سوائے مفوضہ کے، (مفوضہ کے لئے متعہ واجب ہے، مفوضہ وہ ہے جو بغیر کسی تعیینِ مہر کے نکاح کر دی گئی، اور دخول سے قبل طلاق دے دی گئی، یا جس کا مہر مہر فاسد ہو مفوض کہلاتی ہے) مالکیہ کے پاس متعہ ہر مطلقہ کے لئے مستحب ہے، اور مطلقات کی تین تقسیم ہیں:

۱) وہ مطلقہ جو دخول اور مہر کی تعیین سے قبل طلاق دے دی گئی۔ اس مطلقہ کے لئے کوئی متعہ واجب نہ ہوگا۔

۲) وہ مطلقہ جو دخول سے قبل اور مہر کی تعیین کے بعد طلاق دی گئی، اس کے لئے کوئی متعہ واجب نہ ہوگا۔

۳) مطلقہ جسے دخول کے بعد طلاق دی گئی ہو اس کے لئے متعہ واجب ہوگا خواہ طلاق مہر کی تعیین سے قبل ہوئی ہو یا بعد میں ہوئی ہو۔

شافعیہ کے نزدیک متعہ ہر صورت میں واجب ہے، یعنی مالکیہ کے برخلاف، خواہ طلاق قبل الدخول ہو یا بعد الدخول، الا یہ کہ کوئی مطلقہ قبل الدخول ہو، اور مہر کی تعیین کی گئی ہو تو نصف مہر مقرر کیا جائے گا۔ (۹/۳۰۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ)

مذکورہ صورتوں میں حنفیہ کے قول کے برعکس طلاق بجا پر متعہ جب واجب ہے تو موجودہ حالات میں بے جا طلاق دینے والوں پر متعہ کا پابند بنانا بھی جائز تو ہے، یا نکاح کے وقت ہی مہر کی رقم میں ہی اضافہ کر دیا جائے، یا مہر مثل کے دوگنی رقم اضافہ کر دی جائے، یا ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طلاق کے وقت اہل جماعت مناسب متعہ کا فیصلہ کریں اور اسے تسلیم کرنا واجب قرار دیا جائے، اس طرح کے قوانین وضع کئے جائیں کہ نکاح کا بندھن باقی رہے، کثرت طلاق سے معاشرہ کو بچایا جائے، اسی طرح جب عورت بے جا طلاق کا مطالبہ کرتی ہو تو ایسی صورت میں یہ بھی ہونا چاہیے کہ اسے کوئی متعہ ہی نہ دیا جائے۔

البتہ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ طلاق کی صورت درپیش ہو تو جماعت والے/ قاضی/ جمعیت/ جماعت/ دارالقضاء/ شرعی پنچایت کی جانب سے کوئی مناسب رقم تعزیر کے طور پر شوہر سے لی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ طلاق دینے والا ظلما وعدوانا بیجا طلاق دے رہا ہو، کسی معقول سبب کے بغیر طلاق دے رہا ہو تو ایسے لوگوں پر معاشرہ کی طرف سے جرمانہ کی کوئی رقم طے ہو تو تعزیر بالمال جائز ہوگا۔

ارشاد باری ہے کہ ومتعوهن على الموسع قدره وعلى المقتر قدره . (البقرة،) ہاں اُن کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔ نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے۔ مناسب صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عقد نکاح کے وقت ہی اس بات کا پابند بنایا جائے کہ اللہ نہ کرے جب بھی طلاق کی نوبت آئے گی میں ایک ہی طلاق دوں گا، بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں نہیں دوں گا، یعنی متفق علیہ چیز پر عمل کا پابند بنانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں کتاب وسنت کے احکام پر عمل کی توفیق نصیب ہو، دین ودنیا کی سعادتوں سے مالا مال ہوں، وما ذلک على الله بعزيز، وبه نستعين. وصلى الله على نبينا محمد وبارک وسلم والحمد لله رب العالمين.

☆☆☆

□ افکار و نظریات

جہاد اور اسلامی فتوحات۔ایک فکری تجزیہ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے کہ جب بھی کوئی روشنی نمودار ہوتی ہے، تاریکی اس کو نگلنے کی کوشش کرتی ہے، جب بھی بہار کا موسم آتا ہے، اور کلیاں کھلتی ہیں اور پھول مہکتے ہیں تو خزاں کا بہار پر حملہ ہوتا ہے، جب بھی دنیا کے کسی گوشہ میں حق کا آوازہ بلند ہوتا ہے تو باطل اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔نور وظلمت کی یہ کشمکش، بہار اور خزاں کی آویزش، حق اور باطل کا معرکہ دنیا کی تاریخ میں موجود رہا ہے۔اسلام تاریخ انسانی کی سب سے بڑی روشنی اور سچائی ہے، لیکن اسلام کو بھی باطل کے ساتھ کشمکش کا سامنا کرنا پڑا ہے، کچھ لوگ اس نور حق کی حمایت کے لئے کھڑے ہوئے، اور انھوں نے ظلمت کی مخالفت میں امکان بھر حصہ لیا، اسی کوشش کا نام اسلام کی اصطلاح میں جہاد ہے۔ جہاد کا مقصد نہ تو ملک گیری ہے، اور نہ جہاں بانی کا حوصلہ دکھانا ہے، نہ توسیع پسندانہ پالیسی اختیار کرنا ہے اور نہ نوک شمشیر سے ملکوں کے جغرافیے بدلنا ہے، مقصد نہ مال غنیمت ہے نہ کشور کشائی ہے، بلکہ حق کی بلندی اور اس کی اشاعت کے لئے ہر قربانی اور ایثار کو گوارہ کرنا ہے، اور مخالفت کو توڑنا اور مخالفین کے حملوں کو روکنا ہے۔اور اسلامی ملک اور مملکت کی حفاظت کرنا ہے۔

جن لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک صرف اپنی حقانیت کے بل بوتے پر اور اصولوں کی پاکیزگی کی بنا پر کامیاب نہیں ہوتی ہے، بلکہ کامیابی کے پیچھے وہ جماعت ہوتی ہے، جو حق کی حمایت کے لئے عیش وآرام اور جان ومال کو داؤ پر لگا دیتی ہے، یہی مجاہدانہ ذوق ہے جو حق کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے۔مسلمانوں نے مکہ میں سخت ترین مظالم کو برداشت کیا، پھر ایک وقت وہ آیا کہ انھیں ہجرت کرنا پڑی لیکن مدینہ پہنچ کر کے بھی تلواروں کے سائے میں انھیں زندگی بسر کرنی پڑی، راتوں کو پہرہ دینا پڑا، اور انھیں اپنے مذہب اور اپنی سرزمین دونوں کا دفاع کرنا پڑا۔حقیقت یہ ہے کہ حق کی راہ کٹھن ہے، یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے، اسی لئے انسان کو نرم وگرم دونوں قسم کے اخلاق کی حاجت ہوتی ہے، صبر اور ضبط، عفو ودرگزر بڑی خوبصورت اور قابل تعریف صفتیں ہیں، لیکن زندگی کے ہر نشیب وفراز میں کام نہیں دیتی ہیں، ایک انگریز مفکر نے بجا طور پر کہا ہے ''تحمل اپنی جگہ پر ایک اچھی چیز ہے لیکن تم اس کو تو برداشت نہیں کر سکتے جو تم کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اور تمہاری گردن قلم کر دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے''۔نرم اخلاق ایک قابل تعریف اور مثبت صفت ہے، لیکن ہمیشہ زندگی کی باگ ڈور اس کے حوالے نہیں کی جا سکتی، انسان کو اور ہر جماعت کو اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے

نرمی کے بجائے سختی، عدم تشدد کے بجائے تشدد کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے، دنیا کی تاریخ میں تلوار کو کبھی بالائے طاق نہیں رکھا گیا ہے، ہندو اوتاروں اور اسرائیلی سرداروں نے بھی اسے بے نیام کیا ہے، پیغمبروں کو بھی جنگیں لڑنی پڑی ہیں، یہ اس لئے کہ کبھی ایسی صورت حال پیش آتی ہے، کہ ہتھیار اٹھانا ایک اخلاقی ضرورت بن جاتا ہے، جب آزادی پر ہر طرف سے حملے ہونے لگیں، جب عبادت گاہیں خطرے میں پڑ جائیں، جب آبرو اور جان و مال کی کوئی قیمت باقی نہ رہ جائے تو محض تماشائی بن کر کے بیٹھا نہیں جاسکتا۔

اسلام نے حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے جنگ کرنا جائز قرار دیا ہے، یہ جنگ سلطنت وحکومت کی ہوس پوری کرنے کے لئے نہیں کی جاتی تھی، اسلام نے دین کی جبری اشاعت کی بھی ممانعت کی تھی، اور صاف کہہ دیا تھا کہ ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ''(البقرہ) یعنی دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، دوسری جگہ قرآن میں ہے، أَنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (المائدہ) یعنی ہمارے نبی پر یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف پیغام پہنچا دیں، لیکن ہوا یہ کہ پیغمبر ﷺ کو طرح طرح کی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، پرامن تبلیغ کی بھی اجازت نہیں دی گئی، مدینہ ہجرت کرنے کے بعد بھی باطل کی قوتیں بار بار آپ پر اور آپ کی اتباع کرنے والوں پر حملہ آور ہوئیں، ایسی صورت میں بھی اگر آپ مقابلہ نہ کرتے اور تلوار نہ اٹھاتے تو دنیا کے لئے ایسی مثال پیش کرتے جس پر عمل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے اسلام نے ایک بلند مقصد کے لئے آخری تدبیر کے طور پر تلوار اٹھانے کی اجازت دی۔ اور ایک بار جب معرکہ گرم ہوگیا اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو باطل طاقتوں نے مسلسل سازش اور لڑائی کا وطیرہ اختیار کیا، چنانچہ فوجوں کو روانہ کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اللہ تعالی نے مسلمان فوجوں کو فتح یاب کیا، اور دنیا کے بہت سارے ملک اسلام کے زیر نگیں آگئے، مسلمانوں نے جذبہ جہاد اور شوق شہادت کے ذریعہ دنیا کے بہت سے ملک فتح کئے، ان فتوحات کی داستان اسلامی تاریخ کے حیرت انگیز واقعات ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ فاتحین اسلام کے ایمان پرور اور جوش وحمیت سے لبریز واقعات کو مسلمانوں کی نئی نسل کے سامنے پیش کیا جائے۔

جہاد اسلام میں ایک فریضہ ہے، جہاد میں سب سے زیادہ ضروری چیز ڈسپلین ہے، انسان اگر غور کرے تو محسوس کرلے گا کہ اسلامی عبادات میں یہ ڈسپلین پورے طور پر ہے، نماز میں ڈسپلن اور فوجی تربیت کی شان موجود ہے، وقت کی پابندی، فرض شناسی، چستی اور محنت، صفوں کی ترتیب اور درستی اور ایک امام کی اطاعت یہ وہ ساری باتیں ہیں جن میں فوجی ڈسپلین موجود ہے، اور پھر جس طرح سے فوجی کیمپ لگتے ہیں اسی طرح سے جمعہ، عید اور حج کے موقع پر مسلمان ڈسپلین اور نظم وضبط کے ساتھ جمع ہوتے ہیں، اور جس طرح سے ایک فوجی تکلیف برداشت کرنے کی مشق کرتا ہے اسی طرح سے روزے میں بھی ایک مسلمان بھوک پیاس کی مشق کرتا ہے، گویا ایک مسلمان کی زندگی شروع سے آخر تک جہاد کی تربیت ہے، جہاد کا مقصد کسی سرزمین پر مخالفتوں کا زور توڑ کر کے دلوں پر اللہ کی حکومت قائم کرنا ہے، اور دنیا سے ظلم اور زیادتی کو مٹانا ہے، اور عدل وانصاف کو پھیلانا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام نے تاریخ میں ایسے نمونے چھوڑے ہیں جن پر اگر دنیا عمل کرے تو ہمیشہ امن وامان قائم رہے، جہاد بمعنی قتال اگر چہ جنگ ہے لیکن اس کا مقصد خونریزی کا انسداد اور امن وامان کا

قیام اور دین کے قبول کرنے کے معاملہ میں جبر کو ختم کرنا ہے، آنحضرت ﷺ کی تربیت سے ایسے بہادر، دلیر، جانباز سپہ سالار پیدا ہوئے جن کے کارنامے دنیا کی تاریخ میں مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں، یہ مجاہدین یہ فاتحین یہ سپہ سالار تلوار کے دھنی تھے اور راہ خدا میں جان کے زیاں کو کچھ ایسا زیاں نہیں سمجھتے تھے، لیکن یہ تلوار کے دھنی کوئی ظالم و جابر فاتح نہ تھے، بلکہ انسانیت کے خادم تھے، اور بندگان خدا کے لئے خیر خواہ اور ہمدرد تھے، ان کے ہاتھوں سے ضرور کچھ لوگ مارے گئے لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے لوگ امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں، زمین جور وستم سے پاک ہو اور اپنی مرضی سے جو دین اسلام قبول کرے اس پر ظلم نہ ہو۔ اسلام نے جنگ کی اجازت ضرور دی ہے لیکن صرف ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں یا آمادہ جنگ ہوں یعنی ارادہ جنگ رکھتے ہوں اور اشاعت دین میں مزاحم ہوں اور دین اسلام قبول کرنے والوں پر اور اپنی رعایا پر ہر ظلم روا رکھتے ہوں۔ حالت جنگ میں بھی کوئی صلح کی پیشکش کرے تو اسے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حالت جنگ کے بھی اسلام نے وہ اخلاقی قوانین طے کر دئے ہیں جو اس وقت پوری دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے تھے اور اب بین الاقوامی قانون جنگ میں اس کا عکس پایا جاتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو شام کے علاقہ کی ایک مہم پر روانہ فرمایا تو یہ نصیحتیں کیں: کچھ لوگ اپنی عبادتوں میں مشغول ہوں گے ان سے تعرض نہ کرنا، عورتوں کو، بچوں کو اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا، کسی پھل دار درخت کو نہیں کاٹنا، کسی آبادی کو نقصان نہیں پہونچانا (صرف فوج سے لڑنا) اگر تمہاری فوج کو غذا کی کمی نہ پیش آجائے اور مجبوری نہ ہو تو کسی کی بکری اور اونٹ کو ذبح نہ کرنا، کسی باغ کو آگ نہ لگانا، کسی حال میں بدعہدی نہ کرنا اور کسی لاش کا مثلہ نہ کرنا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے مفتوح ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ بہیمانہ سلوک نہیں کیا جیسا کہ عیسائیوں نے اندلس میں مسلمانوں کے ساتھ کیا، انہوں نے سب کو مذہبی آزادی دی، نہ کسی کے رسم ورواج میں رکاوٹ ڈالی نہ کسی کا پرسنل لا ختم کیا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفتوح ملکوں میں آج بھی اکثریت غیر مسلموں کی ہے جیسے ہندوستان میں۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کی رواداری کا بہت بڑا ثبوت ہے، مسلمانوں کا میدان جنگ میں قدم رکھنا شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا تھا اور اپنی جان ومال اور اپنے گھر اور عیش وآرام کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا تھا اور یہ اللہ کی خوشنودی کے لئے تھا اور اسلام کے خلاف جبر وقہر کو روکنے کے لئے تھا، جب وہ میدان جہاد کے لئے نکلتے تھے تو وہ زبان حال سے کہتے تھے:

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

اسلامی تاریخ میں بار بار ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت نے کئی گنا لشکر پر فتح حاصل کی ہے، دس ہزار مسلمانوں کے لشکر نے ایک لاکھ کی فوج کو شکست دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اب مسلمانوں کی تاریخ شکستوں کی تاریخ ہے۔ افغانستان، عراق، شام، مصر ہر جگہ اہل دین نے باطل طاقتوں کے مقابلہ میں پسپائی اختیار کی ہے۔ اسرائیل نے فلسطینیوں کو زدوکوب کیا ہے اور ان کو ان کے وطن سے نکال دیا ہے، برما میں بدھسٹوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے، کسی علاقہ میں مسلمان اکثریت میں ہیں تب بھی مظلومیت کا شکار ہیں۔ اب کہیں فتح کا وہ معجزہ رونما نہیں ہوتا

ہے جو ہماری تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے۔ یہ موضوع بہت اہم ہے کہ مسلمانوں پر نصرت الٰہی کا نزول کیوں نہیں ہوتا ہے، رحمتیں اغیار کے کاشانوں پر کیوں ہیں، برق صرف بے چارے مسلمانوں پر کیوں گرتی ہے، ان تمام سوالات کے جواب اہل فکر ونظر کو دینے ہیں اور لوگوں کو مطمئن کرنا ہے اور اسباب کی نشان دہی کرنی ہے۔ راقم سطور کے نزدیک کچھ خصوصیات ہیں جن کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ خصوصیات اگر امۃ مسلمہ میں نہیں پائی جائیں گی تو اللہ کی مدد نازل نہیں ہوگی اور وہ معجزے ظاہر نہیں ہوں گے جو مسلمانوں کی جنگوں کی تاریخ میں ظاہر ہوے۔ ان تمام خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے اور اگر یہ خصوصیات نہیں پائی جائیں گی تو جس کے پاس عددی طاقت زیادہ ہوگی اور جس کے پاس اسلحے زیادہ اور ترقی یافتہ ہوں گے کامیابی اس کے لئے مقدر ہوگی۔ اللہ کی مدد نازل ہو اس کے لیے ذیل کی صفات کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ مقصد غلبہ اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق ہو۔

۲۔ اسلام کی راہ میں شہادت کا شوق غالب ہو۔

۳۔ توجہ الی اللہ ہو اور احکام الٰہی پر عمل ہو۔

۴۔ وہ تمام ضروری تدابیر اختیار کی جائیں جو اسباب کی دنیا میں اختیار کی جاتی ہیں۔

موجودہ دور میں ہماری شکست وہزیمت مذکورہ صفات سے عاری اور تہی دامن ہونے کی وجہ سے ہے۔ ہم وہ ضروری اور ظاہری تدابیر بھی اختیار نہیں کرتے جو تاریخ میں فاتحین اور مجاہدین نے اختیار کی تھیں، تاریخ اسلام میں جو جنگیں ہوئیں اور جن میں مسلمان غالب اور غازی ہوئے ان جنگوں میں مسلمانوں کی تعداد اور کافر فوجیوں کی تعداد میں فرق اور تفاوت تو پایا جاتا تھا یعنی مجاہدین اسلام کی تعداد کم ہوتی تھی اور دشمنان اسلام کی کئی گنا زیادہ لیکن سامان جنگ اور اسلحہ کا زیادہ فرق نہیں پایا جاتا تھا۔ اگر دشمنوں کے پاس تلواریں ہوتی تھیں تو مسلمانوں کے پاس بھی تلواریں تھیں، اگر کافروں کے پاس تیر اور نیزے ہوتے تھے تو مسلمانوں کے پاس بھی تیر اور نیزے ہوتے تھے، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ دشمنان اسلام کے پاس تو وہ تمام اسلحے ہوں جو اس زمانہ میں ہوا کرتے تھے اور مسلمانوں کے پاس صرف پتھر ہوں یا ڈنڈے ہوں، اگر ہم عہد حاضر میں اپنی ناکامیوں کا تجزیہ کریں تو اس کی وجہ یہ نظر آئے گی کہ ہم نے وقت کے معیار کے اسلحہ نہیں بنائے، ہمارے اور دشمنان اسلام کے اسلحہ میں آسمان اور زمین کا فرق ہے اور اگر یورپ اور امریکہ کے معیار سے کمتر اور بہت کمتر اسلحے موجود بھی ہیں تو وہ بھی یورپ اور امریکہ سے خریدے ہوئے ہیں اپنے بنائے ہوئے نہیں ہیں، مسلمان دولت مند ملکوں کے پاس اسلحہ سازی کا کوئی کارخانہ نہیں ہے، کسی طرح کی کوئی صنعت نہیں ہے، ہر چیز مستعار اور باہر سے منگائی ہوئی ہے اور یہ چیز اس قرآنی حکم کی کھلی خلاف ورزی ہے جس میں اسلحہ سازی کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا معیار یہ کہہ کر متعین کیا گیا ہے کہ ''تا کہ تمہارے دشمنوں اور اللہ کے دشمنوں پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے۔'' اس وقت مسجد اقصی کی بازیابی کے لئے اور فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے فلسطین کے گرد وپیش کی مسلم حکومتوں پر جہاد فرض ہے لیکن گرد وپیش کی عرب حکومتوں نے اپنی مذہبی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا بلکہ نہایت بے غیرتی کے ساتھ اسرائیل کے ساتھ در پردہ روابط قائم کئے صنعت اور اسلحہ سازی کے کام کو پس پشت ڈال دیا اور دنیا کی جو حکومتیں انہیں پامال کرتی ہیں انہی کے سامنے اسلحہ کے لئے کشکول گدائی لیکر جانا انہوں نے سیکھا ہے ان نکمی اور نا اہل

حکومتوں کے خلاف عالمی مسلم رائے عامہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔لیکن یہ کام کون کرے ۔مسلم رائے عامہ باشعور نہیں ہے۔اور علماء خاموش ہیں۔امراء عیش کوش ہیں،حق گوئی کی جرات رکھنے والے کہیں ہیں تو روپوش ہیں۔

اللہ تعالی نے اس دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے ، اللہ کی نصرت کا نزول بھی اسباب کے پردے میں ہوتا ہے،اسباب کے بغیر کامیابی وہ معجزات ہیں جو پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہیں۔جس روز ایمان قوی اور عمل صالح کی نعمت کے ساتھ مسلمانوں کے پاس اسلحہ کی صنعت اور ''وارٹکنالوجی'' آجائے گی،اللہ کی نصرت کا پھر سے نزول کا مشاہدہ ہونے لگے گا اور اقبال کا یہ خواب پھر سے شرمندہ تعبیر ہوگا:

نکل کے صحراء سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

☆☆☆

اسلام اور سیرت نبوی کو علمی وفکری انداز میں پیش کرنا وقت کا اہم فریضہ

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

''مستشرقین نے آپ کی رحمت للعالمینی اور عفو ودرگزری کی صفت کو جو پوری زندگی پر محیط ہے، سنگ دلی سے تبدیل کر دیا، آج مغرب میں نبی کریم ﷺ کے تعلق سے جو تصور قائم ہے اور جس کی ترویج کی جارہی ہے، وہ بدنیت مستشرقین کا دیا ہوا ہے، جوان کے ذہنوں اور دلوں میں ایسا راسخ ہوگیا ہے کہ زمانہ کی ترقیوں اور بحث وتحقیق کے میدان میں نئی نئی تحقیقات وانکشافات کے باوجود آج تک تبدیل نہیں ہوسکا جب کہ بہت سے تصورات جو مسلمات کی حیثیت رکھتے تھے اور عرصہ تک یورپ کے ذہن پر غالب رہے، بدل گئے۔ مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ وہ صاف اور کھلے ذہن سے سیرت نبوی کا مطالعہ کرے اور حقیقت حال کا پتہ لگائے، حالانکہ جو لوگ سیرت نبوی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کی رحمت للعالمینی اور عفو ودرگزر کی صفت کا اعتراف کرتے ہیں۔ بہت سے حقیقت پسند اور انصاف پسند یورپین دانشوروں نے اسلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا، تو وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوکر حلقۂ بگوش اسلام ہوگئے اور اس کا بھی اعتراف کیا کہ ان کی سابقہ معلومات ناواقفیت پر مبنی تھی.....اسلام اور سیرت نبوی کو علمی وفکری انداز میں پیش کرنا وقت کا اہم فریضہ اور مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ہے جو کسی طرح بھی دعوتی فریضہ سے کم اہمیت کی حامل نہیں، بلکہ تقریبا دونوں کی حیثیت یکساں ہی ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی اہمیت وافادیت اور محسن انسانیت ﷺ کی تابناک حقیقی زندگی کو غیر مسلموں کے سامنے علمی وعصری انداز میں پیش کیا جائے، چنانچہ اسلامی اداروں کی اولین ذمہ داری ہے کہ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کے موضوع پر علمی انداز میں ایسی کتابیں تصنیف کریں جن میں ذات رسول ﷺ کے متعلق کئے جانے والے تمام اعتراضات کا تشفی بخش اور قابل اطمینان جواب ہو، اسی کے ساتھ حالات اور قارئین کے مزاج ومذاق کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہو، اس لئے کہ اس قسم کے شکوک وشبہات صرف غیر مسلموں کے ذہنوں ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ مغربی تعلیم یافتہ مسلم طبقہ کے ذہنوں میں بھی غیر مسلموں کے گمراہ کن باطل نظریات کی وجہ سے نت نئے شکوک وشبہات نے جگہ بنالی ہے''۔

(از مقدمہ بر کتاب ''رہبر انسانیت'' ص ۲۱/ ۲۵، تالیف: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم)

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

قضائے حاجت کی تربیت:

بچہ کی ابتدائی عمر میں جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، ان میں پیشاب پاخانے کی عادت ڈالنے کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے، جس کو ہم ''قضائے حاجت کی تربیت'' یا ''بیت الخلا جانے کی مشق'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ دراصل بڑا جذباتی ہوتا ہے، والدین بالخصوص ماں کے لیے بڑا پریشان کن ہوتا ہے، بچے اور ماں کے درمیان بھی کشمکش کا سبب بنتا ہے، خاص طور پر بچہ اگر بار بار پیشاب وغیرہ کر لے، اور عام جگہوں پر ایسا کر گذرے تو ماں بہت پریشان ہوتی ہے اور شرمندگی محسوس کرتی ہے، کیوں کہ وہ اس کے ہم عمر بچوں کی طرح اسے صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہے، وہ امید کرتی ہے کہ اب اس عمر میں اسے اس کو اپنے ہم عمر دوسرے بچوں کی طرح کپڑے نہیں گیلے کرنا چاہیے اور صاف ستھرا رہنا چاہیے، پھر چونکہ یہ مسئلہ والدین کی شرمندگی کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی سماجی یا اجتماعی مشکل کا بھی سبب بنتا ہے، اس لیے بھی والدین پریشان ہوتے ہیں، پریشان ہوکر فیملی ڈاکٹر اور دیگر احباب سے بھی اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو اس مسئلہ کو بچوں کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، چنانچہ ایک بچہ کا مثانہ اگر بھر گیا، یا اس کی آنتوں میں فضلہ بھر گیا تو بالکل فطری تقاضا ہے کہ وہ پیشاب کرے اور فضلہ خارج کرے، ابتدائی مراحل میں بچہ ایسے موقع پر پیشاب و پاخانے کا احساس ہوتے ہی اپنی ضررت پوری کر لیتا ہے، اسے دوسروں کے احساسات وجذبات یا وقت ومقام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، اس کو اگر احساس ہو گیا تو وہ کھانے کے دوران بھی کر لیتا ہے، اس کی بھی فکر نہیں کرتا کہ ابھی ابھی اس کے کپڑے یا اس کی پیکنگ تبدیل کی گئی ہے، وہ بالکل نہیں سوچتا کہ وہ حمام میں ہے یا بستر پر یا اس کو کسی مہمان نے گود میں لے رکھا ہے، یہی نہیں بلکہ عمر کے ابتدائی مراحل میں وہ جس حال میں بھی ہوتا ہے اسی حال میں احساس ہوتے ہی اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور پھر پوری خوشی اور سکون واطمینان کے ساتھ بتاتا ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے۔

انسان کی طبیعت اور فطرت کا یہ حصہ ہے کہ وہ فضلات کو خارج کر کے راحت وسکون محسوس کرتا ہے، یہ کام وہ پوری سہولت سے کر لیتا ہے، یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ انسان اس بنیادی تقاضہ کو پورا کرنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتا اور نہ ہی اپنی جان کو جوکھم میں ڈالتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بچے کے لئے یہ سمجھنا کافی دشوار ہوتا ہے کہ ماں بچے کی اس جسمانی ضرورت وفطرت کو تبدیل کرنے کے لئے آخر اس قدر تگ ودو

کیوں کرتی ہے۔

بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو وہ یہ سب جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ محض اپنی فطری اور جسمانی ضرورت پوری کرنے کے لئے کرتا ہے، اس لیے بغیر کسی پیشگی تنبیہ کے اس سے یکا یک یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے مثانہ اور اپنے آنتوں پر کنٹرول کرے اور پیشاب پاخانے کو روکے، حالانکہ کچھ وقت کے بعد ماں اس کو عادی بنانے کی کوشش کرتی ہے، اس کو پوٹی Potty پر بٹھاتی ہے، بچہ یہ دیکھ دیکھ کر تعجب کرتا ہے کہ وہ جب بھی پوٹی پر بیٹھتا ہے تو ماں دیکھتی ہے کہ اس نے کچھ کیا یا نہیں، اگر وہ خالی ہوتی ہے تو ماں بچہ کو دوبارہ بٹھاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ پھر کوشش کرے، جب بچہ فارغ ہو جاتا ہے اور کچھ کر لیتا ہے تو ماں کو اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے وہ بچے کو سینے سے لگا لیتی ہے کیوں کہ وہ سمجھتی ہے کہ وہ بھی ایک بڑے کام سے فارغ ہوگئی، لیکن اسی دوران اگر بچہ مقام پیشاب پر ہاتھ لگانے لگتا ہے تو ماں چیختی ہے اور منع کرتی ہے کہ ''اس کو ہاتھ مت لگاؤ''۔

اس سے زیادہ تعجب بچے کو تب ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ جس فضلہ کو خارج کر کے وہ راحت وسکون محسوس کر رہا ہے اسی کے سبب ماں غصہ ہو رہی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کو اس کے سبب تھپڑ بھی مار دیتی ہے، گوشمالی کر دیتی ہے، اور ایسے موقع پر بالکل مسکراتی نہیں ہے، نہ ایسی کوئی حرکت کرتی ہے جس سے محبت جھلکے، لیکن جب وہ صاف ستھرا ہوتا ہے، کپڑے وغیرہ سوکھے ہوتے ہیں تو خوب پیار کرتی ہے، گود میں اٹھاتی ہے اور خوشی کا اظہار کرتی ہے۔

بچہ کے نقطۂ نظر سے قضائے حاجت، حمام کے استعمال اور فضلہ خارج کرنے پر کنٹرول سے متعلق ماں کی تربیت کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر آپ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں تو وہ ایک وقت گذرنے کے بعد کنٹرول کرنا اور حمام کو استعمال کرنا سیکھ لے گا، لیکن یہ اس مرحلہ میں ہوگا جبکہ وہ زندگی اور اشیاء کے استعمال ومزاج سے واقف ہوگا، البتہ ہوتا یہ ہے کہ عام طور پر بڑے مراحل زندگی سے قطع نظر اس مسئلہ میں عجلت سے کام لیتے ہیں، اگر عجلت کی بھی جائے اور بچہ کو اس سلسلہ میں صحیح طریقہ اختیار کرنے کا عادی بنایا جائے تو کوئی معیوب بات نہیں ہے، البتہ اس تربیت کے لیے کپڑے نہ خراب کرنے والے اور صاف رہنے والے بچے سے اس کا تقابل نہ کیا جائے۔

پیشاب پاخانہ روکنے کی جو مشق کرائی جائے، اس میں کسی طرح کی سختی نہ برتی جائے، ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے جو اکتاہٹ اور دباؤ کا سبب بنے، بچے اور والدین دونوں کی طرف سے آرام وسکون کے ساتھ یہ مرحلہ طے کیا جائے، اگر توقع کے خلاف نتیجہ ظاہر ہو تو طرفین میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس مشق کے مرحلہ میں سزا کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔

اگر بڑے ان چیزوں کو نہیں سمجھتے ہیں اور ان کا لحاظ نہیں کرتے ہیں، تو وہ خود ہی اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں، پھر صفائی ستھرائی اور قضائے حاجت کی مشق کے لیے مار پیٹ اور چیخ وپکار ہوتی ہے، بچے کے ساتھ زبردستی کی جاتی ہے، اس کو دیر تک پوٹی پر بیٹھنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے، اس سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں وہ اپنی ماں کو خوش کرنے کی خواہش کے باوجود فارغ نہیں ہو پاتا، بچہ سمجھ نہیں پاتا کہ ماں اس سے کیا چاہتی ہے، اور پھر وہ پریشان ہوتا ہے، اس کے علاوہ خوف واضطراب کی صورت میں پیشاب پاخانے پر قابو پانا خود ہی ایک مشکل مسئلہ ہوتا ہے، اس صورت

میں خود بڑے اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کر پاتے۔

بچہ جب قضائے حاجت کے سلسلہ میں صحیح عادت پکڑنے لگے تو اس سلسلہ میں پھر سختی اور جذباتیت نہیں برتنا چاہیے، اس لیے کہ اس موضوع میں زیادہ سختی، شدت اور غصہ بچہ میں خطا اور گناہ کا احساس پیدا کر دیتا ہے، ہر وقت وہ سوچتا ہے کہ گویا اس نے کچھ غلط کیا ہے، پھر اس کا اثر اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر پڑتا ہے، وہ بجھا بجھا رہنے لگتا ہے، اس کے جذبات مرجھائے رہتے ہیں، اس کے اندر اضطراب وقلق کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔

عام طور پر جن بچوں میں وسوسہ کی نفسیات پائی جاتی ہے، یا وہ تردد کا شکار ہوتے ہیں، یا ان میں صفائی کے سلسلہ میں ایسی شدت پائی جاتی جس کے سبب زندگی کو برتنا مشکل ہو جائے، در اصل ایسی نفسیات کا سبب ان کے والدین کی وہ سختی اور شدت ہوتی ہے جو انھوں نے صفائی، پیشاب پاخانے وغیرہ کی تربیت میں اختیار کیا تھا، یہ بڑا مؤثر سبب ہوتا ہے، اس سے والدین کے دیگر امور میں شدت آمیز تصرف وسلوک کا پتہ چلتا ہے۔

یہ مشکل اس وقت دوگنی ہو جاتی ہے جب بچہ میں سرکشی اور ضد کا کچھ مادہ پایا جائے، ایسے بچے عام طور پر والدین کے نظام کے ساتھ نہیں چلتے، اس لیے جب مشق کا عمل شروع ہوتا ہے، اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس سے کیا مطلوب ہے، تو بچہ سرکشی کا اظہار کرتا ہے اور چیلنج کرنا شروع کر دیتا ہے، حتی کہ اس کو پوٹی پر بٹھایا جاتا ہے تو وہ جان بوجھ کر کچھ نہیں کرتا، اور وہاں سے اٹھتے ہی فورا کر لیتا ہے، یا جیسے ہی اس کو صاف کپڑے پہنائے جائیں ویسے ہی کر لیتا ہے، اور پھر یہ صورت حال بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے حتی کہ گھر والے مایوس ہونے لگتے ہیں، اس طرح جو کام انتہائی آسان ہونا چاہیے تھا وہ اتنا مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ سارے گھر والوں کی پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔

گھر والوں کے لیے ان مشکلات سے بچنا کس طرح ممکن ہے ؟:

سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ ماں باپ اس مسئلہ میں سکون واطمینان کا مظاہرہ کریں، اور بالکل بھی پریشانی کا احساس نہ کریں، ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ بچے کے پیکنگ استعمال کرنے کے مرحلہ سے پوٹی استعمال کرنے کے مرحلہ تک منتقل ہونے کے لئے خود بچے کا تعامل اور برتاؤ ضروری ہے، اس کے لیے ظاہر ہے کہ وہ کچھ وقت لے گا، اب اگر اس سلسلہ میں جلدی مچائی گئی تو پھر اس جلدی کرنے کا یہ منفی اثر ہوگا کہ یہ مرحلہ لمبا ہوتا جائے گا۔

اس لیے ماں کو بہر حال صبر سے کام لینا پڑے گا، اور اس مسئلہ کو اس طرح لینا پڑے گا کہ پورے سکون واطمینان اور یقین کے ساتھ اس کو برتا جائے، یہ سمجھتے ہوئے کہ مناسب وقت پر ایک مرحلہ ختم ہوگا اور دوسرا شروع ہوگا، یہ پرسکون تعامل خود بچے میں بھی سکون واطمینان کا احساس پیدا کرے گا، یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قلق واضطراب سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، اس لیے ماں کو چاہیے کہ وہ اس موضوع پر بہت نرمی، سکون اور شفقت کے ساتھ مشق کرائے، اس کی حوصلہ افزائی کرے اور اسے مقصد پورا کرنے پر آمادہ کرے، اگر وہ انکار کرے اور مطالبہ پورا نہ کرے تو اس پر غصہ نہ کرے، اور مطالبہ پورا نہ ہونے پر ناامیدی کے احساسات بچے پر ظاہر نہ کرے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچہ پیکنگ وغیرہ بھگو لیتا ہے، اور پھر ماں اس پر چیختی چلاتی ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ بچہ کا عمل فطری تھا جبکہ ماں کا ری ایکشن بالکل غیر فطری اور غیر صحیح ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ماں کو ایک متعین نظام کی پابندی کرنا چاہیے، کیوں کہ بچہ تیزی کے ساتھ پروان چڑھتا ہے، اگر

وہ ایک متعین نظام کا عادی بن جاتا ہے تو اور تیزی سے عادتیں پکڑتا ہے، وہ دنیا کو ایک منظّم شے کی صورت میں دیکھتا ہے جس سے کہ اس کو ایک منظّم نظام کی پابندی میں مزید مدد ملتی ہے، اس کا اثر اس کی زندگی کے اس پہلو پر بھی منعکس ہوتا ہے۔

قضائے حاجت کو ضبط کرنے کی مشق: عام طور پر بچہ پیشاب پر قابو پانے سے پہلے زیادہ آسانی کے ساتھ پاخانہ پر قابو پانا سیکھ لیتا ہے، بچہ بار بار اور کسی بھی جگہ پاخانہ نہ کرے، اس کی مشق کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت حال کو نظر میں رکھا جائے تو آسانی سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے، عام طور پر بچہ ناشتہ یا دوپہر کے کھانے یا شام کے کھانے کے بعد قضائے حاجت کرتا ہے، اسی وجہ سے ماں کو چاہیے کہ اس کو کھانے کے تھوڑی دیر بعد پوٹی پر بٹھا دیا کرے، یا جس وقت بھی ماں محسوس کرتی ہے کہ اب وہ قضائے حاجت کرے گا وہ اس کو پوٹی پر بٹھا دے، اور اس کو اس وقت تک بٹھائے رکھے جب تک وہ فارغ نہ ہو جائے، یا اگر جلدی سے فارغ نہیں ہوتا ہے تو کم از کم بیٹھے بیٹھے اکتا جائے، کچھ ہی دنوں میں وہ اس نظام کا عادی ہو جائے گا، وہ کھانے کے بعد اس لیے پوٹی پر بیٹھے گا کہ ماں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرے اور اس کی باتیں سنے، کچھ دنوں کے بعد اس کو قضائے حاجت کے لیے اس بیٹھنے اور والدہ کے ساتھ وقت گذارنے میں ربط کا اسے لطیف احساس ہوگا، ماں کے لیے ممکن ہے کہ وہ بچے کی عمر کے پہلے ہی سال میں اس کو اس کی عادت ڈالے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں ہے کہ بچہ کبھی بھی اپنی پیکنگ یا اپنے کپڑوں میں پاخانہ نہیں کرے گا، وہ فطری طور پر ایسا کر سکتا ہے بالخصوص کھانے کے اوقات میں اس کا امکان زیادہ ہے۔

جب بچہ کو کچھ چلنا اور بولنا آجائے تو ماں اس سے مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ پاخانہ کرنے کے لیے اس کو بتا دے، غالب گمان یہی ہے کہ بچہ اس کی پیشگی اطلاع دینے کو اپنی سعادت تصور کرتا ہے، اگر وہ کبھی اپنی پیکنگ میں پاخانہ کر لے تو ماں کو چاہیے کہ اس سے کہے! ''عنقریب تم بھی ان بڑے بچوں کی طرح ہو جاؤ گے جو اپنے کپڑوں میں پوٹی نہیں کرتے''، ماں کو چاہیے کہ اس کو پوٹی پر بیٹھنے کے لئے آمادہ کرے، اس طرح کی عبارتوں اور جملوں مثلاً ''اچھا لڑکا'' کے بجائے ''اچھا عمل'' وغیرہ کے استعمال کی ضرورت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ پیچھے ایک جگہ گزر چکا ہے، اسی طرح حوصلہ افزائی میں مبالغہ سے بھی گریز کرنا چاہیے، کیوں کہ اصل مقصود یہ ہے کہ بچے کو یہ بات سمجھا دی جائے کہ اس کو ہر حال میں پوٹی پر بیٹھ کر ہی قضائے حاجت کرنا چاہیے، بسا اوقات بچہ اپنے جسم سے نکلنے والے فضلہ کو دیکھنا چاہتا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اسے دیکھنے دینا چاہیے، بلکہ اس کو سمجھانا چاہیے کہ جسم اپنے فضلات سے کسی طرح نجات حاصل کرتا ہے۔

پیشاب کو ضبط کرنے کی مشق:

عام طور پر مثانہ پر قابو رکھنا اور پیشاب کو روکے رکھنے کا مرحلہ بہت دیر میں آتا ہے، اس لیے ماں کو اس سے پہلے کے مرحلہ سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، کیوں کہ اس مرحلہ میں عام طور پر کپڑوں میں پیشاب وغیرہ کرنے کے حادثات پیش آتے ہیں، اور یہ سلسلہ تب تک چلتا ہے جب تک اچھی طرح مثانہ پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں پیدا ہو جاتی، بچے عام طور پر مثانہ کے عضلا کے پھیلے ہونے کے سبب بچیوں سے جلدی عادی ہو جاتے ہیں، البتہ مشق و تربیت کے مراحل سے دونوں کو گزرنا پڑتا ہے، عام طور پر بچہ جب پوٹی پر بیٹھتا ہے تو وہ پیشاب کر کے اپنے مثانہ کو خالی کر لیتا ہے، اسی طرح فضلہ

خارج کر کے اپنی آنتیں خالی کر لیتا ہے، اسی لیے جلدی وہ پوٹی پر بیٹھنے اور پیشاب و پاخانہ کرنے کے مابین ربط کو سمجھ لیتا ہے، بچہ پیشاب روک سکتا ہے یا روکنے کا اہل ہوگیا ہے اس کی پہلی علامت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ دو یا دو سے زائد گھنٹوں تک اس کی پیکنگ سوکھی رہتی ہے، اور کبھی کبھی تو پوری رات بلکہ صبح تک پیشاب نہیں کرتا، لیکن یہ بات عام طور پر ۱۶ سے ۱۸ ماہ کی عمر کے مرحلہ میں پیدا ہوتی ہے، اس مرحلہ میں مناسب یہ ہوتا ہے کہ پوٹی کو کسی مناسب جگہ پر رکھ دیا جائے، اور ہر دو گھنٹہ بعد اس کو اس پر بیٹھا دیا جائے، یا جب بھی ماں کو اس کے پیشاب کرنے کا احساس ہو یا وہ خود مطالبہ کرے تو اس پر بیٹھا دیا جائے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ پیشاب کرنے کو کہتا ہے مگر کچھ بھی نہیں کرتا، تو اس میں کوئی حرج نہیں، یہ فطری بات ہے، عنقریب وہ اس کا عادی ہوجائے گا کہ جب بھی وہ پوٹی پر بیٹھے تو پیشاب کرے، اس مرحلہ میں ماں کو یہ کرنا چاہیے کہ جب بچہ اس کے ساتھ گھر میں ہو تو اس کو پیکنگ نہ باندھے، البتہ اچانک پیش آنے والی مصیبت کے لیے تیار رہے، کچھ ہی دنوں میں بچہ سیکھ لے گا کہ جب اس کو پیشاب کرنے کا احساس ہو تو اسے خود جا کر پوٹی پر بیٹھ جانا چاہیے، اس طرح وہ اپنے آپ پر خود اعتمادی کے سبب فخر کا اظہار بھی کرے گا، اور ماں بھی اس پر اور اس کی صلاحیتوں پر اعتماد کرے گی۔

کبھی کبھی جب بچہ کسی چیز میں زیادہ منہمک ہوتا ہے مثلاً کھیل وغیرہ میں تو اس دوران وہ پیشاب کر لیتا ہے، کیوں کہ اسے پیشاب کرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بالکل عین وقت پر اس کو شدت سے احساس ہوتا ہے، اسی لیے کبھی کبھی عین اس وقت کپڑوں میں ہی کر لیتا ہے جبکہ وہ پیشاب کرنے کے لیے کہہ رہا ہوتا ہے، یا پوٹی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے، ایسے مواقع پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کو اچھی طرح سمجھیں، کہ بچے کے لئے خوشی ومسرت کے احساس اور مثانہ کے بھر جانے کے احساس اور پیشاب کرنے کی ضرورت کے احساس میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، چنانچہ ایسے موقع پر اس کو ڈانٹنے سے یا سرزنش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اگر بچہ کبھی بازار یا رشتہ داروں کے یہاں پیشاب کر لے تو اس میں قطعی کوئی حرج نہیں اور یہ کسی طرح بھی باعث عار نہیں، کیوں کہ بچہ ابھی اپنی عمر کے ابتدائی مرحلہ میں ہے اور ابھی صفائی ستھرائی کے طریقوں سے واقف ہونے اور سیکھنے کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

رات میں پیشاب کرنا:

بعض ایسے اسباب ہوتے ہیں جن سے رات میں بستر پر پیشاب کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، جیسے ٹھنڈک یا رات میں سونے سے قبل زیادہ پانی پینا یا مشروبات پینا وغیرہ، اسی لیے سونے سے قبل زیادہ مشروبات سے گریز کرنا چاہیے، اور سونے سے قبل ماں کو ایک بار بچے کو پوٹی پر بیٹھا دینا چاہیے، اسی طرح یہ بھی سودمند ہے کہ جب تک بچہ رات بھر پیشاب نہ کرنے والے مرحلہ تک نہیں پہنچتا تب تک اس کے پیکنگ کی جائے، لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رات میں پیکنگ کا استعمال ضرورت سے زیادہ نہیں کرنا چاہیے، کبھی کبھی پیشاب کرنے کے واقعات پیش آسکتے ہیں، اور یہ تو تب تک ہوگا جب تک بچہ پوری طرح رات میں پیشاب روکنے کا عادی نہیں ہوجاتا، البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کے نیچے کوئی ایسی چیز بچھا دی جائے جس سے پیشاب بستر میں نہ سرایت کرے۔

اگر بچہ رات میں پیشاب کر لے تو اس پر کوئی ہنگامہ نہیں برپا کرنا چاہیے، صرف بچہ کو اطمینان دلانا چاہیے کہ شروع

شروع میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے، ماں کو چاہیے کہ اس کو خوف، پریشانی اور شرمندگی کا احساس نہ ہونے دے، کیوں اس طرح کے احساس سے پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے اور مشکل مزید بڑھ سکتی ہے۔

اگر بچہ بار بار رات میں پیشاب کرتا ہے اور بستر پر پیشاب کا عادی ہے، تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، یا تو رات میں پیشاب بذات خود اس کے لیے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے اور وہ اس کو لے کر پریشانی کا شکار ہے، یا پھر وہ ایسا اپنے والدین کے ردعمل کے سبب کر رہا ہے، یا گھر میں پائی جانے والی کسی اور مشکل کے سبب کر رہا ہے جس سے اس کو پریشانی ہو رہی ہے، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی بچہ بالقصد رات میں بستر پر پیشاب کرے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ ہلکا سے بیدار ہوتا ہے، نیم بیداری اور نیند سے مغلوب حالت میں ہوتا ہے تو وہ پیشاب کر لیتا ہے اور صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں کر پاتا۔

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی بستر پر پیشاب کر لیتے ہیں، اس صورت میں ماں کو چاہیے کہ بچہ کے خود بیدار ہونے سے پہلے ہی اس کو جگائے اور فورا اس کو حمام میں لے جائے، ماں جس قدر صبر وسکون سے اس مرحلہ کو جھیل لے گی اسی قدر تیزی سے بچہ اس مرحلہ سے گزر کر رات بھر پیشاب نہ کرنے کے مرحلہ میں داخل ہوجائے گا، اگر کسی رات میں کبھی کبھی بچہ پیشاب کر لے تو اس کو نظر انداز کرنا چاہیے، خاموشی سے اس طرح بستر تبدیل کر دینا چاہیے گویا کچھ ہوا ہی نہیں، بلکہ جس رات وہ پیشاب نہ کرے، اس رات اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے'' آج تم نے اچھا کیا، آج تمہارا بستر سوکھا ہے'' وغیرہ، یہاں بار بار سکون واطمینان اور خاموشی کے الفاظ کا استعمال وتکرار یہ سمجھانے کے لئے ہے کہ اس عمل میں کہیں بھی انفعالی کیفیت نہیں پیدا ہونا چاہیے، کوئی ردعمل نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ اس سے صرف اور صرف مشکلات میں اضافہ ہوگا، البتہ اگر یہ مشکل زیادہ مدت تک دراز ہوتی ہے اگر چہ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے، تو پھر ماں یہ کر سکتی ہے کہ مثلا بچے کو کچھ رنگین ستارے دے دے، اور اس سے کہے کہ جب بھی تم رات میں پیشاب نہیں کروگے تو اس میں سے ایک ستارہ کاپی یا بورڈ پر چپکایا جائے گا، جن راتوں میں وہ پیشاب کر لے ان سے اعراض کرتے ہوئے جب ان ستاروں کی تعداد پندرہ بیس ہوجائے تو اس کو کچھ اور خرید کر دینا چاہیے نا کہ بستر پر پیشاب نہ کرنے کے مزید اسباب فراہم کیے جاسکیں اور اس کی مزید حوصلہ افزائی کی جا سکے، اس طرح کے طریقہ علاج کی اہل خانہ کو بہت کم ہی ضرورت پڑتی ہے، اب اگر اس کے بعد بھی اس مشکل کا حل نہیں نکلتا تو پھر اہل خانہ کو کسی طبیب سے مراجعت کرنا چاہیے، وہ مختلف جانچوں کے بعد متعدد طرق علاج میں سے کچھ مناسب علاج تجویز کرے گا جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

ماں کے لیے یہ بھی سودمند ہے کہ وہ اپنے آپ سے مندرجہ ذیل سوالات کرے!

- کیا گھر یا اسکول میں کوئی ایسی بات تو نہیں جو بچے کے لیے پریشانی کا سبب ہو جیسے والدین کے درمیان جھگڑا وغیرہ؟
- کہیں بچہ میں کوئی مرض تو نہیں کہ اس کو طبیب سے مراجعت کی ضرورت ہو؟
- کہیں ماں کی طرف سے پیشاب نہ کرنے کی مشق میں اس پر بے جا تشدد تو نہیں ہوتا؟
- کہیں ماں اس کو یہ احساس تو نہیں دلاتی کہ وہ ناکام ہے، برا ہے، کیوں کہ وہ کپڑوں میں یا بستر پر پیشاب کرتا ہے؟

- کہیں ماں پیشاب نہ کرنے کے لئے اس پر سخت ترین شرائط تو نہیں لاگو کرتی ہے؟

- کہیں ماں پیشاب کر لینے پر مار پیٹ اور سزا وغیرہ کا استعمال تو نہیں کرتی ؟

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے کو پیشاب نہ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے، وہ بول و براز پر قابو پانا سیکھ چکا ہوتا ہے، لیکن اچانک کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، اور وہ پھر سے پیشاب وغیرہ کرنے لگتا ہے، مثلاً اس کے کسی بھائی یا بہن کی ولادت ہوتی ہے اور پھر وہ اپنی پرانی عادت دوہراتا ہے، اس کا مطلب کہ وہ اپنے آپ کو اچانک غیر محفوظ اور غیر مامون تصور کرنے لگتا ہے، اور کبھی تو محض اس لیے وہ نومولود بچے کے سلوک کی اتباع کرتا ہے کہ وہ اسی کی طرح اپنی ماں کی توجہ اور اہتمام حاصل کر سکے، اس صورت میں ماں کو چاہیے کہ بچے کو یہ اطمینان دلائے کہ یہ بھی جب تمہاری طرح بڑا ہوگا تو پیشاب نہیں کرے گا اور تمہاری ہی طرح رہنا سیکھ لے گا، مزید یہ کہ ماں اس پر بھی ضروری توجہ دے تا کہ وہ از سر نو اپنے آپ کو مامون و مطمئن محسوس کرے۔

جو سوال بار بار سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ آخر پیشاب پاخانہ پر کنٹرول کے لیے طبعی طور پر کتنا وقت درکار ہوتا ہے؟ اس کا جواب کسی متعین اصول کے مطابق نہیں دیا جا سکتا، اور نہ ہی کوئی ایسی محقق و متعین بات ہے جو ہر بچہ پر منطبق ہوتی ہو، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر ۱۸ ماہ کی عمر میں بچہ پوٹی کے استعمال کو سمجھ لیتا ہے، اور کبھی کبھی اس عمر میں وہ پاخانہ روکنے پر بھی قادر ہو جاتا ہے، حالانکہ عام طور پر یہ صلاحیت دو سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔

۱۸ ماہ کی عمر میں بچہ پیشاب کرنے کے لئے پوٹی کا مطالبہ کرنے لگتا ہے، البتہ پوٹی تک پہنچتے پہنچتے یا اس پر بیٹھتے بیٹھتے پیشاب کر لینے کی شکایت پھر بھی باقی رہتی ہے، دو سال کی عمر میں بچے عام طور پر کپڑوں میں یا بستر پر پیشاب نہیں کرتے اور دن و رات میں اپنے پاخانہ کرنے پر کنٹرول حاصل کر چکے ہوتے ہیں، دوسرے سال کی دوسری چھ ماہی میں بچے عام طور پر رات میں پیشاب کر لینے کی عادت بھی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ رات میں ایک مرتبہ ماں ان کو نیند سے اٹھا کر حمام لے جائے، عمر کے تیسرے سال میں اس کی بھی ضرورت نہیں رہتی، بچے بغیر حمام گئے بھی رات بھر پیشاب پر قابو رکھتے ہیں، اس طرح اس مسئلہ کی مشق مکمل ہو جاتی ہے، البتہ شاذ واقعات درمیان میں پیش آجاتے ہیں، جو قابل اعتنا نہیں۔

اگر کسی پریشانی کے سبب بچہ دوبارہ وہ عادت پکڑ لے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ نومولود کے سبب ایسا کرنے لگے، تو ظاہر ہے کہ یہ ایک عبوری اور عارضی مرحلہ سمجھا جائے گا جو چند دنوں میں گزر جائے گا، ظاہر ہے کہ بچے کے اندر بڑا ہونے کی نفسیات پائی جاتی ہیں، وہ چاہتا ہے کہ وہ بڑا ہو اور دوسروں کی طرح سارے کام انجام دے، اس لیے ایسے مراحل میں ماں کو بھی اس کے ساتھ شیر خوار کی طرح سلوک نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ خود ہی اس کے مسلسل بستر پر پیشاب کرنے کا سبب بنے گی، اسی لیے ہرگز دوبارہ اس کے لیے پیکنگ وغیرہ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس پر مناسب توجہ دی جائے اور اس کی توقعات پر پورا اترا جائے، اس سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ امکانات پر بھی اعتماد کرنا سیکھے گا۔

☆☆☆

سماجیات

گلوبلائزیشن کا فتنہ اور مسلم خاندانوں پر اس کے اثرات

مولانا سید احمد ومیض ندوی
(استاذِ حدیث دارالعلوم حیدرآباد)

دور حاضر کے جن فتنوں نے عالمگیر سطح پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں اور جن سے مسلم معاشرہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے ان میں سرفہرست گلوبلائزیشن ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر محسوس فتنہ ہے جس کا ظاہر انتہائی پرفریب اور خوشنما ہے لیکن اس کے اثرات دین وایمان، اخلاق وتہذیب اور مذہبی اقدار کے لیے انتہائی تباہ کن ہیں۔ دیگر فتنوں کی طرح یہ فتنہ بھی مغربی دشمنانِ اسلام کے راستہ سے آیا ہے اور اس کی آبیاری کرنے والے یہود ونصاریٰ ہیں جن کی اسلام دشمنی ظاہر وباہر ہے۔

گلوبلائزیشن، گلوب سے ماخوذ ہے جس کے معنی کائنات کے ہیں۔ گلوبلائزیشن کا ترجمہ عالمی بنانا ہے۔ اردو میں اس کے لیے عالم کاری کا لفظ استعمال ہورہا ہے۔ گلوبلائزیشن کی اصطلاح سے پہلے مغرب نے نیو ورلڈ آرڈر (نیا عالمی نظام) کا نعرہ بلند کیا تھا۔ جن مقاصد کے لیے مغربی طاقتوں نے نئے عالمی نظام کا نعرہ بلند کیا تھا گلوبلائزیشن انہی مقاصد کی تکمیل کا نام ہے۔ گلوبلائزیشن اگرچہ تجارت کو بین الاقوامیانے کے لیے بولا جاتا ہے اور اس کا بنیادی مقصد خالص معاشی بتایا جاتا ہے لیکن اس کے اہداف انتہائی گہرے اور پہلودار ہیں۔ دین، اخلاق، تہذیب، تمدن اور قدریں سب اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کی تعریف اور اس کی وضاحت کے لیے محققین کی آراء کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

گلوبلائزیشن کی ایک تعریف یوں کی گئی ہے کہ گلوبلائزیشن سرمایہ دار تجارت کو بین الاقوامیانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس عمل کے لیے دوسرا لفظ آزاد تجارت کا استعمال ہوتا ہے۔ (آئی او ایس جرنل جلد 12 جنوری تا جولائی 2000ء)

عرب مصنف علی المزروعی گلوبلائزیشن کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''گلوبلائزیشن کیا ہے؟ یہ ان طریقوں کے لیے بولا جاتا ہے جو عالمی پیمانے پر باہمی انحصار اور دور دراز کے علاقوں سے تیز تر رابطہ اور تبادلہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ گلوبلائزیشن خود ہی بالکل نیا لفظ ہے لیکن حقیقت میں اس کا آغاز صدیوں پہلا ہوگیا تھا۔ چار قوتیں گلوبلائزیشن کی گاڑی کو آگے بڑھانے میں خاص رول ادا کرتی ہیں۔ دین ومذہب، معیشت، ٹکنالوجی اور ریاست۔ (امریکہ کا گلوبلائزیشن پر خاص نمبر 1989ء)

فری عرب وائس کے ایک مضمون میں گلوبلائزیشن کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''گلوبلائزیشن صاف طور پر ایک معاشی اسٹراٹیجی ہے جو دنیا پر ثروت منداور صنعتی ملکوں کے ذریعہ مسلط کی گئی ہے۔ اس کا مقصد ان عالمی کارپوریشن کے مفادات کا حصول ہے جن کا

جال ہر طرف بکھرا ہوا ہے اور جن کو ٹرانس نیشنل یا ملٹی نیشنل کمپنیاں کہا جاتا ہے۔اس معاشی اسٹراٹیجی کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں کو اپنے لیے کھولا جائے۔ ان کے بہترین وسائل وذرائع اور ثروت کو ان کارپوریشن کے تحت کر دیا جائے جو کسی قید وشرط اور حدود کے پابند نہ ہوں۔

(اسلامیۃ المعرفۃ ابراہیم ابوربیع ص ۱۷)

ہندوستان کے معروف ماہر معاشیات ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی لکھتے ہیں:

''گلوبلائزیشن کے ظاہری معنی پوری دنیا کو ایک مارکٹ بنانا ہے اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو بین الاقوامی تجارت میں حائل ہیں تاکہ سرمایہ بلا رکاوٹ ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کر سکے اور جس جگہ بھی اس کی ضرورت ہو وہاں سرمایہ کاری کی جاسکے۔ اس طرح محنت بھی ہر جگہ کا سفر کر سکے اور جہاں بھی اس کو زیادہ اجرت ملے وہاں اپنی خدمت پیش کر سکے۔ اس میں سرمایہ اور محنت دونوں کا بھلا ہے۔(زندگی نو،نومبر/دسمبر 2000)

امریکہ اور یوروپ کے اکثر ممالک عرصہ دراز سے گلوبلائزیشن کے علمبردار ہیں۔البتہ کمیونزم اس کا مخالف تھا۔ جہاں تک ایشیاء اور تیسری دنیا کے ممالک کی بات ہے تو انہوں نے 80 کی دہائی میں کمیونزم کے زوال کے بعد گلوبلائزیشن کو گلے سے لگایا۔ 1991ء سے جب معاشی اصلاحات کا عمل شروع ہوا ہندوستان بھی گلوبلائزیشن کے راستہ پر گامزن ہوا۔ مصری اسکالر ھناء محمد گلوبلائزیشن کے آغاز پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ثقافتی طور پر گلوبلائزیشن کی اصطلاح گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں مشہور ہوئی ہے لیکن عملاً اس کی بنیاد 1965ء ہی میں پڑ گئی تھی۔ جب المجمع المسکونی کی دوسری میٹنگ کے تمام کیتھولک چرچوں کے اتحاد پر زور دیا گیا تھا تاکہ وہ متحد ہوکر اسلام کا مقابلہ کر سکیں اور 90 کی دہائی میں اسے روئے زمین سے نیست ونابود کر سکیں۔1978ء میں ایسی دوسری المسکونی کانفرنس کلوراڈو میں ہوئی جس میں خاموش طریقہ سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تدابیر کے سلسلہ میں چالیس نکات پر بحث ومباحثہ ہوا۔(المجتمع،9مارچ 2007)

جہاں تک عالمگیر برادری کے تصور کی بات ہے تو اگرچہ اسلام سے پہلے عیسائیت نے بھی اس تصور کو اپنایا تھا لیکن تاریخ کے کسی دور میں وہ اس کا عملی مظاہرہ نہ کر سکے۔ پھر بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں کمیونزم نے بھی عالمی برادری کا تخیل پیش کیا لیکن چونکہ اس کی بنیاد انکار مذہب پر رکھی گئی تھی اس لیے اس کو دوام حاصل نہ ہوسکا۔پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس جب دو سوپر پاور بن کر ابھرے تو انہوں نے محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک بار پھر عالمگیر برادری کا نعرہ بلند کیا اور اس مقصد کے لیے مجلس اقوام کا قیام عمل میں لایا گیا چونکہ اس کے قیام میں نیک مقاصد کارفرما نہ تھے اس لیے بہت جلد پوری دنیا کو ایک خطرناک جنگ میں جھونک دیا گیا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد روس اور امریکہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کی شکل میں سامنے آئے لیکن دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے اس لیے دونوں میں سرد جنگ کی فضاء قائم ہوئی اور دنیا دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ دوسرے درجہ کی طاقتوں نے طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ایک بار پھر عالمگیر برادری کی آواز اٹھائی۔اس طرح اقوام متحدہ وجود میں آیا لیکن اس پر مفادات غالب آ گئے اور اس کے پانچ دائمی ارکان کے ہاتھوں میں حق تنسیخ دے دیا گیا۔ جنگ خلیج کے بعد

امریکہ کی جانب سے ایک بار پھر عالمی نظام کا نعرہ بلند کیا گیا اور اس کے ساتھ گلوبلائزیشن کی اصطلاح رواج پا گئی۔

گلوبلائزیشن کے نقصانات:

گلوبلائزیشن پر خود مغربی دانشوروں کی جانب سے بھی منفی اور مثبت موقف کا اظہار کیا جارہا ہے۔ مغرب کے کچھ اصحاب علم نے گلوبلائزیشن کو انسانی معاشرہ کے لیے مفید اور ترقی کا باعث گردانا ہے تو مغربی دانشوروں کے ایک بڑے طبقہ نے اس کی شدید مخالفت کی ہے۔ گلوبلائزیشن کی تائید میں لکھنے والے مغربی مفکرین میں جیز ے فاچس اور تھامس فرائیڈے کافی مشہور ہیں۔ ان کی نگاہ میں گلوبلائزیشن انسانی برادری کے لیے مثبت اثرات رکھتا ہے۔ غریب ممالک میں بیرونی سرمایہ کی آمد سے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں جس سے غربت کے خاتمہ میں مدد ملتی ہے۔ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں میں عصری ٹکنالوجی اور مصنوعات کی فراہمی سے عوام کا معیار زندگی اونچا ہوتا ہے۔ صنعتی ترقی کے سبب روزگار کے جدید مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ صحت عامہ میں بہتری کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں مہیا ہوجاتی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے حامیوں کے نزدیک گلوبلائزیشن سے حقوق انسانی، حقوق نسواں اور انسانی قدروں کو فروغ ملنے سے جمہوریت کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے لیکن یہ اس کے ظاہری منافع ہیں۔ ان سے ہٹ کر گلوبلائزیشن کے نقصانات اور منفی اثرات انتہائی تباہ کن ہیں۔ گلوبلائزیشن کے ظاہری نقصانات میں یہ ہے کہ اس سے ملکی صنعتیں ٹھپ پڑ جاتی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے نتیجہ میں دنیا بھر کی کمپنیاں اور تجارتی ادارے ملک میں داخل ہوجاتے ہیں۔ بیرونی اشیاء کے ملک میں داخلہ سے مقامی صنعتیں بری طرح متاثر ہوجاتی ہیں۔ جن مقامی صنعتوں میں بیرونی اشیاء کے مقابلہ کی سکت ہوتی ہے وہ ٹک پاتی ہیں بقیہ مصنوعات اور ان کی فیکٹریاں راستہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ اس سے مزدوروں کے حقوق متاثر ہونے لگتے ہیں۔ جان رب، نوم چومسکی وغیرہ گلوبلائزیشن مخالفین کا کہنا ہے کہ:

''گلوبلائزیشن سے بلاشبہ کسی ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن چونکہ دولت منصفانہ طور پر تقسیم نہیں ہوتی اس لیے عدم مساوات پیدا کرتی ہے۔ گلوبلائزیشن کے نتیجہ میں آنے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں سرمایہ اور خوشحالی کا فائدہ صرف اس چھوٹی سے اقلیت کو ہوتا ہے جو تعلیم یافتہ اور پیشہ وارانہ قابلیتوں سے آراستہ ہوتی ہے، چونکہ اس عمل کے نتیجہ میں معیشت کے روایتی ذرائع یعنی زراعت، چھوٹی تجارت، گھریلو صنعتیں وغیرہ متاثر ہوتی ہیں اس لیے آبادی کا بڑا حصہ خصوصاً غریب اور کمزور طبقات شدید نقصان اٹھاتے ہیں۔ دیہی معیشت تباہ ہوجاتی ہے اور چند لوگوں کی خوشحالی کے لیے عوام کی اکثریت کو بھاری قربانی دینی پڑتی ہے۔ اسی طرح گلوبلائزیشن کا عمل ملک کے اقتدار اعلیٰ کو متاثر کرتا ہے۔ حکومت کے اختیارات کم ہوجاتے ہیں۔ وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بااثر عالمی اداروں کے سامنے بے بس ہوجاتی ہیں۔ اور چونکہ حکومت کے برخلاف ملٹی نیشنل کمپنیاں یا عالمی ادارے جمہوری طریقوں سے عوام کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل نہیں ہوتے اس لیے وہ نہ عوام کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اور نہ عوام کے مسائل و مفادات سے انہیں کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس طرح گلوبلائزیشن کا عمل سیاسی سطح پر جمہوریت کی بنیادی روح کو ختم کردیتا ہے۔''
(رفیق منزل رہنمائے عہد نو خصوصی اشاعت جنوری 2008ء)

گلوبلائزیشن کا سب سے بڑا نقصان تہذیب وتمدن اور قدروں کی بربادی کی شکل میں ہورہا ہے اور مسلمانوں کے لیے

یہ پہلو سب سے زیادہ تشویشناک ہے۔ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی نظر میں تہذیب وتمدن کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ ان کی اپنی کوئی تہذیبی شناخت نہیں ہوتی لیکن اسلام کی اپنی مستقل تہذیب ہے۔اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔گلوبلائزیشن کے نتیجہ میں ساری دنیا پر مغربی تہذیب کا تسلط قائم ہونے لگا ہے۔

''دنیا بھر میں مغربی تہذیب کے غلبہ اور مقامی تہذیبوں کے خاتمہ کا ذریعہ بن رہا ہے۔ماس پروڈکشن کے اس دور میں بڑی کمپنیاں ایسی اشیاء کوفروغ دے رہی ہیں جو خالصتاً مغربی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں۔کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے میں مغربی طریقوں کو ساری دنیا پر مسلط کیا جارہا ہے۔ہندوستان کے بہت سے دیہاتوں میں بھی نئی نسل روایتی مقامی مشروبات سے ناآشنا ہوتی جارہی ہے اور پیپسی کولا کی دیوانی ہوتی جارہی ہے۔اسی طرح ماس میڈیا پر عالمی طاقتوں کے غلبہ کے باعث رہن سہن طرز ہائے حیات خیالات اور لوگوں کے تصورات پر بھی بیرونی تہذیبی عناصر غالب ہوتے جارہے ہیں۔ ہم جنسی، عریانیت اور جنسی بے قاعدگی جیسے معاملات جن سے مشرقی معاشرے ناآشنا تھے اب تیزی سے ان معاشروں میں بھی عام ہوتے جارہے ہیں۔''(رفیق منزل عہدنوخصوصی اشاعت جنوری2008ء)

گلوبلائزیشن سب سے زیادہ مسلم خاندانی زندگی پر اثر انداز ہورہا ہے۔اسلام خاندانی زندگی کے استحکام پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ خاندانی و عائلی زندگی کا استحکام، آپسی رشتوں کے احترام، محبت ومودت، خیرخواہی وہمدردی، باہمی الفت اور حقوق کی ادائیگی سے ہوتا ہے۔ خاندانی زندگی میں عورت کا اہم رول ہوتا ہے۔عورتوں کے حقوق کی پامالی یا انہیں بے لگام کردینے سے عائلی ڈھانچہ کھوکھلا ہونے لگتا ہے۔ گلوبلائزیشن سے خاندانی زندگی پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ مصری اسکالر ہناء محمد گلوبلائزیشن کے اس خطرناک پہلو پر توجہ مبذول کرواتے ہوئے لکھتی ہیں:

''گلوبلائزیشن نیو ورلڈ آرڈر گلوبل ولیج اور لارج میڈل ایسٹ'' ان تمام اصطلاحات کا ایک مشترک ہدف ہے اور وہ ہے اسلام کی عزت وشوکت کو نابود کرنا اور اسلام کے اس نظام خاندان کو ختم کرنا جو اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اہل مغرب باوجود اپنی ترقی یافتہ تہذیب کے ایسا نظام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسلام کے نظام خاندان میں عورت کو مرکزیت حاصل ہونے کی وجہ سے وہ ان سازشوں کا اوّلین ہدف بنی ہوئی ہے۔ جن کے تانے بانے خفیہ طریقے سے بنے جارہے ہیں تاکہ اسے اس کے دینی تشخص سے عاری کردیا جائے اور ثقافتی طور پر گلوبلائزیشن کے تقاضوں کا پابند بنادیا جائے۔'' (المجتمع ۳/مارچ ۲۰۰۷ء)

گلوبلائزیشن کے ذریعہ مسلم خاتون اور اسلامی نظام خاندان کو کس طرح نشانہ بنایا جارہا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہناء محمد لکھتی ہیں کہ:

''اس کے لیے متعدد وسائل کا استعمال کیا جارہا ہے۔مثلاً عورتوں کی مقامی تنظیموں کے لیے بیرونی دولت فراہم کی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ گلوبلائزیشن کے منصوبوں کو نافذ کیا جاسکے۔اسی طرح عورتوں سے متعلق بین الاقوامی قراردادوں اور اقوام متحدہ کی کانفرنسوں کی تجاویز کے نفاذ کے لیے معاشی دباؤ ڈالا جاتا ہے۔اقوام متحدہ کی تجاویز آوارگی کو فروغ دیتی ہیں اور ناجائز تعلقات کے لیے بھی فائدہ کا اعلان کرنے والی ہیں۔عورتوں کو مارکٹنگ کے لیے وسیلہ کے طور پر استعمال کرکے

انہیں سامان تجارت کی حیثیت دے دی جارہی ہے۔فحش اور عریاں گانوں کے ذریعہ عورتوں کو بے حیا بنایا جارہا ہے۔ عورتوں سے متعلق ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنسوں کی دستاویزات میں دینی و اخلاقی تحفظات کو ختم کردینے پر زور دیا گیا اور یہ باور کرایا گیا ہے کہ مذہب بس ایک موروثی سلسلہ ہے جسے بے چون و چراں قبول کرنے پر عورت بے چاری مجبور ہے۔اسی طرح ان قراردادوں میں یہ بھی کہا گیا کہ زوجیت اور امومت عورت پر جبر کے ذرائع ہیں۔گھریلو کام میں عورت ایسی مشقت میں مبتلا رہتی ہے جس میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔حتی کہ بعض مسلم خواتین گلوبلائزیشن کے پروپگنڈہ سے متاثر ہوکر اساسیاتِ دین پر تنقیدیں کرنے لگی ہیں اور بعض بنیادی تعلیمات مثلاً وراثت،عورت کی گواہی اور عدت وغیرہ کو منسوخ کرنے کا تک مطالبہ کرنے لگی ہیں۔'' (حوالہ سابق)

مسلم خاندان پر گلوبلائزیشن کے اثرات صاف محسوس کئے جاسکتے ہیں۔گلوبلائزیشن کے نتیجہ میں مسلم خاندان اختلاف و انتشار کا شکار ہورہے ہیں۔افراد خاندان میں باہمی مدد کا جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے۔ربط وتعلق کمزور ہورہا ہے،خودغرضی اور مفاد پرستی بام عروج کو پہنچ چکی ہے۔ ہر فرد کو خاندانی مفاد و استحکام سے زیادہ ذاتی مفاد عزیز ہورہا ہے۔اولاد میں والدین کی نافرمانی تشویشناک حدتک بڑھتی جارہی ہے۔اولاد ماں باپ کو پسماندہ اور پرانے خیالات کا تصور کرنے لگی ہے۔ دوسری جانب خود ماں باپ میں اولاد کے تئیں ذمہ داریوں کا احساس ختم ہوتا جارہا ہے۔اب ماں باپ اولاد کو اپنی پرتعیش زندگی کے لیے رکاوٹ سمجھنے لگے ہیں۔شفقت پدرانہ اور ماں کی ممتا مفقود ہوتی جارہی ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کی تعمیر سیرت اور روحانی تربیت سے دامن بچاتے ہیں۔ایک ہی جگہ اور ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے لوگ پڑوسیوں سے کٹے ہوئے رہتے ہیں۔لفٹوں اور سیڑھیوں سے چڑھتے اترتے بارہا آمنا سامنا ہوتا ہے لیکن بات چیت تو دور سلام تک نہیں کرتے۔ پڑوسیوں کا حسن سلوک قصہ پارینہ بنتا جارہا ہے۔ ہر خاندان دوسرے خاندان سے کٹا ہوا زندگی گزار رہا ہے۔ خاندان کے بزرگوں سے نیازمندانہ روابط اور ان کا ادب و احترام ختم ہوتا جارہا ہے۔ اب گھر کے نوجوان بوڑھوں اور بزرگوں کو بوجھ خیال کرنے لگے ہیں۔ بیت المعمرین جدید کلچر کا ایک حصہ بن گیا ہے۔گھر کے بوڑھوں سے جان چھڑانے کے لیے انہیں بیت المعمرین میں شریک کرایا جاتا ہے۔

خاندانی انتشار اور خودغرضی اور مفاد پرستی کی بڑھتی وباء نے خاندانی جرائم میں خوب اضافہ کیا ہے۔ باپ کا اپنی اولاد کو قتل کرڈالنا اور اولاد کا باپ کو قتل کرنا،شوہر کا بیوی کو اور بیوی کا شوہر کو قتل کردینا اور محرم رشتہ داروں کے ساتھ بدکاری عام ہورہی ہے۔گلوبلائزیشن کے ان اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے دینی شعور کی بیداری اور مضبوطی کے ساتھ دین پر عمل آوری ضروری ہے۔گلوبلائزیشن دراصل دین بیزاری اور دین سے آزادی کی دعوت ہے۔اس کا مقابلہ دین پسندی اور شریعت پر سخت عمل آوری کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلہ میں علماء اور داعیانِ امت پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔مسلم معاشرہ کو گلوبلائزیشن کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں اپنی دعوتی واصلاحی کوششوں میں تیزی لانی ہوگی۔

☆☆☆

□ انکار حدیث

شریعت اسلامی میں حدیث کا مقام

محمد فرید حبیب ندوی

پہلی فصل:

قرآن وحدیث کا باہم منصب ومقام:

قرآن حکیم کا ایک ایک حرف قطعی اور یقینی ہے، صحابہ کرام نے اسے رسول اللہ ﷺ سے اخذ کیا اور پھر یہ تواتر کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔

قرآن پہنچانے کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی ایک ذمہ داری اور بھی تھی، اور وہ تھی اس کی تفسیر وتشریح، اس لئے قرآن سمجھنے کے لئے صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ کی تشریحات وتفسیرات کی بھی ضرورت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام ہی اہل اسلام سوائے فرق ضالہ کے، اس پر متفق ہیں کہ حدیث رسول شریعت کا مصدر ہے اور حرام وحلال کی معرفت کے لئے اس کی طرف رجوع ناگزیر ہے، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پیش کی جاچکی ہے، اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن کے مقابلے میں حدیث کا کیا مقام ہے؟ کیا دونوں کی حیثیت برابر ہے یا حدیث کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے؟

یہ تو سب جانتے ہیں کہ قرآن قطعی الثبوت ہے اور احادیث متواترہ کے سوا تمام احادیث ظنی الثبوت ہیں، اس سے پتہ چلا کہ حدیث کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے۔

دوسری بات یہ کہ حدیث یا تو قرآن کی تفسیر وتوضیح پر مشتمل ہوگی، یا اس پر کسی بات کا اضافہ کرے گی، اگر وہ مفسِر ہوگی تو اس اعتبار سے بھی قرآن کو اس پر اولیت حاصل ہوگی، کیونکہ متن شرح سے مقدم ہوتا ہے، اور اگر وہ اس میں اضافہ کررہی ہے، تو اس کا اضافہ بھی اس صورت میں قابل قبول ہوگا، جب کہ قرآن میں موجود نہ ہو، اس حیثیت سے بھی اس کا درجہ قرآن کے بعد ہوا۔

عقل بھی یہی کہتی ہے اور نقلی روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت معاذ والی روایت میں ہے، جسے ابوداؤد اور ترمذی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کس کے مطابق فیصلہ کروگے، تو انھوں نے پہلے قرآن کا نام لیا، پھر حدیث کا۔ اور حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو لکھا تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو پہلے قرآن میں تلاش کرو، اس میں نہ ملے، تو حدیث کی طرف رجوع کرو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی یہی بات فرمائی ہے۔ نیز حضرات شیخین کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ کسی مسئلے کے حل کے لئے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے، اس میں نہ ملتا تو حدیث کا سہارا لیتے۔

قرآن کے مقدم ہونے کے سلسلے میں ہم نے جو تفصیل بیان کی، وہ ان علماء کے نظریات سے متصادم ہے، جو حدیث کو قرآن کے لئے فیصل (قاضی علی الکتاب) مانتے ہیں، وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حدیث قرآن کے مجمل کی تفسیر اور مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص کا کام کرتی ہے، اس لئے قرآن کے ظاہر کو چھوڑ کر حدیث کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی قرآن میں

دو باتوں کا احتمال ہوتا ہے اور حدیث ایک کی تعیین کر دیتی ہے، تو اس طرح بھی قرآن کے مقتضی کو چھوڑ کر حدیث پر عمل ہوتا ہے، اس کی مثال آیت سرقہ ہے، کہ اس میں ہاتھ کا ذکر ہے، اور ہاتھ کا اطلاق انگلیوں سے کہنیوں تک ہوتا ہے، مگر حدیث نے بتایا کہ ہاتھ بس کلائی تک کاٹا جائے گا۔ اسی طرح قرآن میں بلا استثناء اموال کی زکوۃ کا حکم دیا گیا ہے، مگر حدیث نے مال کی بعض قسموں کو اس حکم سے مستثنی قرار دیا۔

ان قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث یا تو قرآن پر مقدم ہے، ورنہ اس کے مساوی ضرور ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کی مثالوں میں دراصل حدیث قرآن کے منشا کی وضاحت کرنے والی ہوتی ہے، کوئی نیا حکم ثابت نہیں کرتی، اور حدیث کے قاضی علی الکتاب ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ قرآن کی تشریح وتوضیح کرنے والی ہے، یہ مطلب نہیں کہ وہ قرآن پر مقدم ہے۔

بعض اوقات حضرت معاذ والی روایت پر جرح کی جاتی ہے کہ ترمذی نے اسے منقطع قرار دیا ہے اور جوزجانی نے اسے موضوع کہا ہے، اس لئے اس پر کسی دینی قاعدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات شیخین اور حضرت ابن مسعود وابن عباس وغیرہم کا عمل اس حدیث کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، گویا ان کے عمل سے اس حدیث کے معنی ومفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے تو یقیناً اخبار آحاد کا درجہ قرآن کے بعد ہے، لیکن اجتہاد اور فہم نصوص کے اعتبار سے وہ قرآن کے مساوی درجہ رکھتی ہیں، کیونکہ قرآن کے مصداق کو طے کرنے کے لئے حدیث کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اسی طرح اگر قرآن وحدیث میں تعارض ہوجائے تو دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے، بہ یک قلم حدیث کو ترک نہیں کیا جاتا، اس پہلو سے بھی گویا وہ مساوی ہے۔

کیا حدیث مستقل ماخذ تشریع ہے؟

علماء کے یہاں بالاتفاق حدیث کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ احادیث جن سے قرآنی احکام کی بس تائید ہوتی ہو، تفصیل وتشریح نہیں۔ مثلاً وہ احادیث جن میں نماز وزکوۃ وحج وغیرہ کی فرضیت کا ذکر ہے، ارکان وشرائط کی تفصیل نہیں۔

۲۔ وہ احادیث جو قرآنی احکام کی تفسیر ووضاحت کرتی ہوں، جیسے وہ احادیث جن میں نماز وزکوۃ وغیرہ کے ارکان وشرائط اور دیگر امور کی وضاحت کی گئی ہے۔

۳۔ وہ احادیث جو ایسے احکام بیان کریں، جو قرآن میں موجود نہ ہوں، جیسے یہ حدیث کہ پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی سے ایک ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا، اسی طرح زانی کو سنگسار کرنے والی حدیث یا دادی کی وراثت بیان کرنے والی حدیث۔

پہلی دونوں قسموں کے بارے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، بلاشبہہ ایسی احادیث سے احکام کا اثبات ہوتا ہے، اور ایسی ہی احادیث کی تعداد زیادہ ہے، البتہ تیسری قسم کی احادیث کے بارے میں اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ ایسی احادیث سے احکام کا اثبات کیوں کر ہوتا ہے؟ آیا اس وجہ سے کہ یہ احادیث بذات خود مستقلاً جدید احکام کی مثبت ہیں، یا اس لئے کہ وہ بھی نصوص قرآن کے دائرے میں داخل ہیں، گرچہ انھیں قرآنی نصوص کے تحت داخل کرنے کے لئے ان میں تاویل کرنا پڑے۔

امام شاطبی اور بعض علماء نے دوسرا پہلو اختیار ہے، جب کہ جمہور نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے۔

امام شافعیؒ حدیث کی تین قسمیں کرنے اور پہلی دو کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''تیسری قسم کی احادیث کے بارے میں علماء سے حسب ذیل اقوال منقول ہیں:

۱۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ چونکہ اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے ،اس لئے آپ کو اختیار ہے کہ ایسی باتوں کا حکم کریں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں۔

۲۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ آپ کی ہر حدیث کی اصل قرآن میں ضرور موجود ہوتی ہے، جیسے قرآن نے نماز کا حکم دیا اور آپ نے اس کی رکعات بتائیں، یا قرآن نے ''وأحل اللہ البیع ''میں بیع کا ذکر کیا، اور آپ نے بیع کی قسمیں ذکر فرمادیں۔

۳۔ اللہ تعالی نے خصوصی پیغام کے ذریعے آپ کو ان احکام کو مقرر فرمانے کا حکم دیا تھا۔

۴۔ اللہ تعالی نے آپ کے دل میں القاء کیا تھا، جس کی بنا پر آپ نے وہ احکام بیان کئے''۔

ان میں پہلے، تیسرے اور چوتھے قول کا مطلب یہ ہے کہ احادیث مستقل ماخذ شریعت ہیں، اور دوسرے قول کا مطلب ہے کہ وہ قرآنی نصوص کے تحت داخل ہوتی ہیں۔

حدیث کو مستقل ماخذ شریعت ماننے والوں کے دلائل:

۱۔ اس میں عقلاً کوئی بعد نہیں کہ جب آپ معصوم تھے، تو مستقل احکام بیان فرمائیں۔

۲۔ قرآن کی جن آیات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع واطاعت کو واجب کہا گیا ہے، ان میں حدیث کی تینوں قسموں کے درمیان کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے۔ قرآن میں جہاں بھی اطاعت رسول کو اطاعت خداوندی کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے، وہاں اطاعت خداوندی سے مراد قرآنی احکام ہیں، اور اطاعت رسول سے مراد آپ کی وہ احادیث ہیں، جن میں بیان کردہ احکام قرآن میں موجود نہیں، اس لئے کہ اگر وہ احکام قرآن میں موجود ہوتے تو انھیں اطاعت خداوندی میں شمار کیا جاتا۔

۳۔ بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ احکام شریعت کے دو مصدر ہیں، ایک قرآن اور دوسرا حدیث، جیسے ایک حدیث میں آپ نے منکرین حدیث کے بارے میں پیشن گوئی کرتے ہوئے فرمایا: ''جس شخص کو میری کوئی حدیث پہنچی اور اس نے اس کی تکذیب کی تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور اس کے راوی کو جھٹلایا'' (اوسط طبرانی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں ایسے احکام بھی ہوتے ہیں جو قرآن میں موجود نہیں ہوتے، اور وہ بھی واجب التعمیل ہیں۔

۴۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ''ہمارے پاس اس قرآن کے سوا کچھ موجود نہیں، مگر جو کچھ میرے اس رسالے میں ہے، یا وہ فہم وشعور جو اللہ تعالی کسی کو عطا فرمادے''۔

اسی طرح حضرت معاذ والی حدیث۔

ان سے ثابت ہوتا ہے کہ احادیث میں قرآن سے باہر بھی احکام مذکور ہوتے ہیں۔

حدیث کو مستقل ماخذ نہ ماننے والوں کے دلائل:

یہ حضرات دلیل میں کہتے ہیں کہ حدیث اپنے معنی ومفہوم میں قرآن ہی کی طرف راجع ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس کے مجملات کی تفصیل اور مشکلات کی توضیح کرتی ہے، قرآن میں آپ کے بارے میں ہے کہ آپ اعلی اخلاق پر فائز تھے، اور حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ آپ ﷺ کے اخلاق وعادات قرآن پر مبنی تھے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے اقوال وافعال وتقریرات سب قرآن سے ماخوذ تھے۔ اور پھر قرآن کو "تبیانا لکل شیء '' کہا گیا ہے، اس کا بھی لازمی تقاضا ہے کہ حدیث فی الجملہ قرآن میں شامل ہو۔

یہ دلائل امام شاطبی نے ''الموافقات'' میں ذکر کئے ہیں۔

فریق ثانی کی طرف سے فریق اول کے دلائل کا جواب:

(الف): آپ جن آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، ہمارا کہنا یہ ہے کہ ان کی مراد یہی ہے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی تشریحات کو قبول کرو، رسول اللہ ﷺ کی تشریحات کی اطاعت کرنا خدا کی ہی اطاعت

ہے۔اطاعت خدا اور اطاعت رسول کو الگ الگ بیان کرنے کے معنی یہ نہیں کہ دونوں بہمہ وجوہ مطاع ہیں۔

(ب): لہذا حدیث میں جو کچھ موجود ہے، اس کا سرا قرآن سے ہی ملتا ہے، ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث میں کچھ احکام قرآن سے زائد بھی ہوتے ہیں، مگر ان کے زائد ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ سرے سے قرآن میں ان کا ذکر ہی نہیں، بلکہ یہ اس اعتبار سے ہے کہ شرح مشروح سے زائد ہی ہوتی ہے۔

یہ صرف لفظی اختلاف ہے:

اگر آپ غور کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ صرف لفظی اختلاف ہے، پہلا فریق کہتا ہے کہ مستقل ماخذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حدیث سے ایسے احکام کا اثبات ہوتا ہے، جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتے۔اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ اگرچہ وہ احکام صراحۃً اس میں مذکور نہیں ہوتے، تاہم وہ کسی نہ کسی نص قرآنی کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔لہذا کسی حدیث صحیح سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو قرآن میں وارد نہ ہو صراحۃً یا ضمناً۔

گویا دونوں کے نزدیک حدیث میں کچھ ایسے احکام ضرور ہوتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتے، ایک فریق انھیں مستقل بالذات قرار دیتا ہے اور دوسرا انھیں قرآنی نصوص کے زمرے میں داخل شمار کرتا ہے۔نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

دوسری فصل: قرآن وحدیث کا باہمی تعلق: جب سنت قرآن کے لیے مبین ہے اور امام شاطبی وغیرہ کی رائے کے مطابق قرآن حدیث میں آئی ہوئی ہر چیز پر اجمالاً یا تفصیلاً دلالت کرتا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ احادیث میں بہت سے ایسے احکام ملتے ہیں جو قرآن میں کہیں وارد نہیں؟

اس کی وضاحت کے سلسلہ میں علماء کے پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: قرآن سے حدیث پر عمل کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اس طرح حدیث پر عمل درحقیقت قرآن پر ہی عمل ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسی کو اختیار کیا ہے، ایک موقع پر بنو اسد کی ایک عورت آئی اور کہنے لگی اے ابوعبدالرحمٰن (ابن مسعود کی کنیت) مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ ان عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں، جو اپنے اعضاء گود کر ان میں رنگ بھرتی ہیں، اور دانتوں کو باریک کروا کر اپنی صورت کو تبدیل کر لیتی ہیں؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: ''جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے میں کیوں نہ لعنت کروں، اور جب کہ وہ قرآن میں بھی ہے، وہ عورت کہنے لگی کہ میں نے پورا قرآن پڑھ ڈالا، مجھے کہیں بھی یہ بات نہ ملی، حضرت نے فرمایا: ''کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ''مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا''. [الحشر :۷] (جو کچھ تمہیں رسول دیں، تو اسے لے لو، اور جس سے تمہیں روکیں، اس سے رک جاؤ''۔

حضرت عبدالرحمٰن بن یزید نے ایک محرم کو دیکھا کہ اس نے کپڑے پہن رکھے ہیں، آپ نے اسے منع کیا، تو اس نے کہا: ''اس کی دلیل کے طور پر کوئی آیت پیش کیجئے''، آپ نے یہی آیت پڑھی: ''مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا''. [الحشر:۷]۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت طاؤس کو عصر بعد دو رکعت پڑھنے سے روکا، تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سنت پڑھنے سے منع کیا ہے (نہ کہ نفل)، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے عصر بعد دو رکعت پڑھنے سے روکا ہے، اب مجھے نہیں معلوم کہ ان دو رکعت پر اجر ملے گا یا سزا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ''۔[الاحزاب:۳۶] (کسی ایمان والے مرد اور ایمان والی عورت کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار نہیں رہتا، جب کہ اللہ اور اس کے رسول فیصلہ کر دیں)۔

دوسرا قول: قرآن مجمل ہے اور حدیث مفصِل، لہذا نماز، روزہ، حج، زکوۃ، بیوع ومعاملات وغیرہ کے ارکان وشرائط

اورآداب ومستحبات اصل میں قرآن کے اجمال ہی کی تفصیل ہیں ،اس اعتبار سے یہ تمام تفصیل قرآن کی اس آیت:''وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ''[النمل :۴۴](اور ہم نے یہ نصیحت آپ کی طرف اس لیء اتاری ہے، تاکہ لوگوں کے لئے واضح کردیں جو ان کی طرف اتارا گیا ہے))کے تحت آجاتی ہے۔

حضرت عمران بن حصین نے ایک شخص سے کہا(جس نے غالباً کسی حدیث کورد کیا تھا) کہ تم احمق ہو، یہ بتاؤ کہ ظہر کی نماز چار رکعت ہے اور سری ہے، قرآن میں یہ بات کہاں ہے؟ پھر اسی طرح آپ نے زکوٰۃ اور نماز کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ احکام پوری تفصیل کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں؟ قرآن نے تو مبہم انداز میں بیان کیا ہے، حدیث نے اس کی تفصیل کی ہے۔

مطرف بن عبداللہ سے کہا گیا کہ آپ ہمیں صرف قرآن سے بتایئے ،تو آپ نے کہا کہ''ہم بھی قرآن کا کوئی بدل نہیں چاہتے، مگر قرآن کے بارے میں میں اس ذات کی باتیں بتاتے ہیں جو قرآن کا علم ہم سے زیادہ رکھنے والی ہے''۔

اسی وجہ سے امام اوزاعی نے کہا ہے کہ جتنی ضرورت حدیث کو قرآن کی ہے، اس سے کہیں زیادہ ضرورت قرآن کو حدیث کی ہے، کیونکہ قرآن کی وضاحت وتفصیل حدیث سے ہی ہوتی ہے۔

امام احمد نے بھی فرمایا کہ حدیث قرآن کی تفصیل وتوضیح کرنے والی ہے۔

تیسرا قول: قرآنی احکام کے جو کلی مقاصد ہیں احادیث انہیں کے اندر محدود ہوتی ہیں،اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن انسانوں کے لیے دنیوی اور اخروی سعادت وخوش بختی کو ثابت کرتا ہے،اور یہ سعادت بنیادی طور پر تین چیزوں میں منحصر ہوتی ہے۔

۱۔ **ضروریات:** جس میں دین وایمان، جان ومال اور عقل ونسل انسانی کی حفاظت شامل ہے۔

۲۔ **حاجیات:** ایسے احکام جن میں وسعت دے کر تنگی کو دور کیا گیا ہے، جیسے سفر یا مرض کے موقع پر روزہ نہ رکھنے کی رخصت۔

۳۔ **تحسینیات:** مکارم اخلاق اور محاسن عادات وغیرہ۔

قرآن میں ان ہی تین چیزوں کو اصولاً اور کلیاً بیان کیا گیا ہے اور حدیث نے انھی کی تفریع وتفصیل کی ہے۔

چوتھا قول: قرآن میں کبھی کبھی دو ایسے حکموں کو بیان کیا جاتا ہے جو باہم ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں،(جیسے ایک طرف حرام تو دوسری طرف حلال چیزوں کا ذکر)اور پھر کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو ان دونوں میں سے ہر ایک کے مشابہ ہوتی ہے،اور اس کا حلال یا حرام ہونا واضح نہیں ہوتا اور جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتی،سنت اس کو ان دونوں میں سے کسی ایک سے ملحق کردیتی ہے، یا اس کے بارے میں کوئی ایسا خاص حکم بیان کرتی ہے، جو دونوں کے مناسب ہوتا ہے، اور کبھی قرآن میں کسی چیز کے اندر کوئی علت پائی جانے کی وجہ سے اس کا کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے اور حدیث قیاس کے ذریعہ ان چیزوں کو اس حکم سے ملحق کردیتی ہے،جن میں وہی علت موجود ہوتی ہے۔

دو متقابل حکموں کی مثالیں:

۱۔ اللہ تعالی نے طیبات کو حلال کیا اور خبائث کو حرام۔ اب بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ خبائث میں سے ہیں یا طیبات میں سے،تو حضور ﷺ نے ان کی وضاحت کی اور بتایا کہ یہ خبائث میں سے ہے اور یہ طیبات میں سے۔چنانچہ آپ نے ذی ناب من السباع اور ذی مخالب من الطیور کے کھانے سے منع کیا اور انہیں خبائث سے ملحق کیا،اور گوہ ،خرگوش اور سرخاب کو طیبات سے ملحق کیا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کے شکار کو حلال اور طیبات کی فہرست میں رکھا، اور مردار کو خبائث کی فہرست میں داخل کر کے اسے حرام قرار دیا ،اب سمندری مردار کا حکم مشتبہ ہوگیا کہ وہ دونوں میں سے کس قسم میں ہے ، تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ سمندر کا مردار حلال ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے میتہ کو حرام کیا اور مذبوحہ کو حلال، اب جو بچہ مذبوحہ ماں کے پیٹ سے مردہ نکلا، اس کے حکم کے سلسلے میں اشتباہ ہوا کہ اسے مذبوحہ مانا جائے یا میتہ، آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ جنین مذبوحہ کے حکم میں ہے۔

دوایک جیسی چیزوں کے درمیان کسی خاص حکم کی مثالیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح اور ملک یمین کو حلال کیا، اور زنا کو حرام قرار دیا، لیکن قرآن میں ایسے نکاح کے بارے میں کوئی حکم نہیں بیان کیا جو شریعت کے مخالف ہو، جو نہ تو نکاح محض ہے اور نہ ہی زنا محض، اب حدیث نے اس کی وضاحت کی کہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے والی عورت کا نکاح باطل ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے جان کے بدلہ جان اور کسی عضو انسانی کے عوض اس عضو کا قصاص مقرر کیا ہے۔ پھر حدیث نے قتل خطا میں دیت اور اسی طرح اگر کوئی عضو خطا سے ہلاک ہوجائے تو اس میں دیت مقرر کی، اس جنین کا حکم جو اپنی ماں کے پیٹ سے اس وجہ سے ساقط ہوجائے کہ کسی نے اس کو مارا ہو اس کا کوئی حکم نہیں بیان کیا، اب یہ ایک اعتبار سے تو انسان کے ایک جزء کے مشابہ ہے اور دوسرے اعتبار سے مکمل انسان کے مشابہ ہے کیونکہ تام الخلقت ہے۔ اب حدیث نے اس کا حکم بیان کیا کہ اس کی دیت غرہ یعنی باندی یا غلام۔

قیاس کے ذریعہ ملحق کی گئی چیزوں کی مثالیں:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کیا، علت یہ تھی کہ اس میں بغیر عوض کے زیادتی پائی جاتی ہے، اس علت کی وجہ سے حدیث میں چھ چیزوں کو تفاضل اور ادھار کے ساتھ بیچنے کو حرام قرار دیا گیا۔

۲۔ جمع بین الأختین کو حرام کیا گیا، علت یہ تھی کہ اس سے قطع رحم کا اندیشہ ہے، حدیث نے اس علت کی وجہ سے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کو حرام کیا۔

۳۔ قرآن میں رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح کو حرام کیا گیا، حدیث میں تمام رضاعی رشتوں کا یہی حکم بیان کیا گیا۔

پانچواں قول: حدیث کے تمام تفصیلی احکام کو قرآن میں موجود تفصیلی احکام کی طرف لوٹایا جائے گا، اس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی، حضور پاک علیہ السلام نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اپنے صاحبزادے کو حکم دو کہ رجوع کرلیں، پھر چھوڑے رکھیں یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائے پھر اس کو حیض آئے پھر پاک ہوجائے، پھر اگر وہ چاہیں تو روک لیں اور چاہیں تو بغیر ملاقات کے طلاق دے دیں، اسی طریقہ سے طلاق دینے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾. (الطلاق:۱) ترجمہ: ''اے پیغمبر! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لحاظ سے طلاق دو''۔

۲۔ مطلقہ البتہ کو نفقہ کا تو حق نہیں ہوتا مگر سکنی کا ہوتا ہے، لیکن جب فاطمہ بن قیس کو طلاق البتہ ہوئی تو آپ نے نہ تو انہیں نفقہ دلایا اور نہ ہی سکنی، اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے گھر والوں کے خلاف زبان درازی کی، آپ کا یہ حکم دراصل قرآن کی اس آیت کی تفسیر تھا: ﴿وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ﴾. (الطلاق:۱)، ترجمہ: ''اور نہ وہ خود نکلیں سوائے اس کے کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں''۔

۳۔ سبیعہ اسلمیہ کے یہاں ان کے شوہر کی وفات کے پندرہ دن بعد بچے کی ولادت ہوئی، تو آپ نے ان سے کہا کہ تم حلال ہوچکی ہو، یعنی عدت پوری ہوچکی ہے، آپ کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوئی کہ ﴿وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾. (البقرہ:۲۳۴)، ترجمہ: ''اور تم میں سے جن لوگوں کی وفات ہو جائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں، وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دنوں

روکے رکھیں''۔غیر حاملہ کے ساتھ خاص ہے، اور﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾۔(الطلاق:۴)، ترجمہ:''اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کو ولادت ہو جائے''۔مطلقہ اور غیر مطلقہ دونوں کے لیے عام ہے۔

اس طرح کی حدیثیں بڑی تعداد میں ہیں،لیکن حدیث کے تمام احکام کو اس نقطۂ نظر کے مطابق قرآنی نصوص سے ثابت نہیں کیا جاسکتا،الا یہ کہ عربی اسالیب بیان اور قرآن کے معیار بلاغت سے صرف نظر کرلیا جائے،امام شاطبی کے بقول یہ اس دشواری کی پہلی دلیل یہ ہے کہ حدیث کے بہت سے احکام نماز، حج، زکوۃ، حیض، نفاس، لقطہ، فرائض مساقاۃ اور قسامات وغیرہ بے شمار امور ہیں جنھیں قرآنی نصوص سے پوری طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا،الا یہ کہ ایسے تکلف سے کام لیا جائے، جسے نہ کلام عرب ہی قبول کر سکے اور نہ سلف صالحین اور علماء راسخین تسلیم کرسکیں''۔

قرآن کے اندر ہی حدیث کے محصور ہونے کے یہ اہم مسالک اور نقطہائے نظر ہیں، ایک رائے تو عام ہے جس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے حدیث پر عمل کے وجوب کو ثابت کیا ہے۔

ایک رائے کے مطابق تمام احادیث اس نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

ایک اور رائے کے مطابق تمام احادیث میں اس کی وسعت و گنجائش ہے۔

بہتر بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان تمام طریقوں اور نقطہائے نظر کو ایک دوسرے کے لیے مکمل مانا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ تمام مسالک اس بات کے ضامن ہیں کہ تمام احکام سنت کو (اگر چہ ان میں بعض احادیث سے جدید احکام ہی کیوں نہ ثابت ہوئے ہوں) قرآنی نصوص کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے، اور اسی کے مطابق قرآن کی اس آیت کی بہترین تفسیر اور اچھی توجیہ ہوسکتی ہے﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾.(الانعام:۳۸) ترجمہ:''ہم نے''لوح محفوظ''میں کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے''۔

حدیث میں آئے ہوئے قصص ومحاورات:

حدیث کے ذخیرہ میں کچھ قصے، محاورے اور نصیحتیں بھی ہیں، ان کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، کچھ تو ایسی ہیں جنھیں قرآنی نصوص کی تفسیر سمجھا جاسکتا ہے جیسے﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً﴾ (البقرۃ:۵۸)، ترجمہ:''دروازۂ شہر میں تواضع کے ساتھ سر جھکا کر داخل ہونا''۔کے سلسلے میں حدیث''دخلوا یزحفون علی أوراکهم''،(وہ لوگ اپنے سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے)اور﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ (البقرۃ:۵۹)،ترجمہ:''مگر ان ظالموں نے اس بات کے بجائے جو کہنے کا حکم دیا گیا تھا،اس کے برخلاف بات کہی''۔کے سلسلہ میں''قالوا حبة شعرة''وغیرہ۔

جبکہ کچھ ایسی ہیں جنہیں قرآنی نصوص کے ذیل میں نہیں رکھا جاسکتا، اور نہ ہی ان میں کسی عقیدہ وعمل کا بیان ہے،اس لیے یہ ضروری بھی نہیں کہ قرآن میں ان کی اصل بھی ہو۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی حدیثوں کو قرآن میں آئے ہوئے ترغیبی اور تربیتی قصوں کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے، اس اعتبار سے اس طرح کی حدیثیں بھی، قسم اول کے تحت آجاتی ہیں، مثلاً اقرع ابرص اور اعمی کے قصہ والی حدیث، جریج بزرگ اور ان تین اشخاص کا قصہ جنہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔اس طرح کے قصوں پر مشتمل تمام حدیثیں قرآنی نصوص کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہیں۔

☆☆☆

□ تجزیہ

مسلم دنیا پر مغربی استعمار اور اس کے نتائج

ذیشان سارہ
اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

تمہید:

'استعمار' کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ملک کے ذریعہ دوسرے ملک یا علاقہ کو بتدریج اور منظّم طریقہ سے سیاسی اور اقتصادی طور پر محکوم بنالیا جائے، یا ایسے علاقوں کو اپنے ماتحت برقرار رکھنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ موجودہ سیاق میں استعمار سے مراد یورپی ممالک کا وہ طرز عمل ہے جو انھوں نے پندرہویں اور سولہویں صدی میں جغرافیائی دریافتوں کے بعد سمندر پار والے علاقوں میں' نیز اس کے بعد کے زمانوں میں جنگ، فتوحات اور خالی علاقوں میں نو آبادکاری کے حوالے سے انجام دیا۔ اس سلسلے میں فرانس اور پرتگال نے نوآبادکاری کی ابتدا کی۔ پھر انگلستان اور ہالینڈ، پھر ڈنمارک، ناروے اور سویڈن بھی اس میں شامل ہوگئے، اور یہ ممالک اپنی استعماری مملکت وسیع کرتے گئے۔ اس حیثیت سے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ استعمار ایک ظالمانہ اور انسانیت کے لئے ایسا ناپسندیدہ عمل ہے جس میں ایک ملک اپنے ریاستی حدود کی توسیع کے لئے دوسرے ملک پر قبضہ کر کے اور اس کو محکوم بنانے کی پالیسی کے تحت جابرانہ اقدام کرتا ہے، اور وہاں پر اپنی نو آبادیات قائم کرتا ہے۔ اور اس راہ سے اس محکوم یا مقبوضہ علاقہ کا جغرافیائی، سیاسی اور معاشی استحصال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر قابض ملک اپنی فوجی طاقت اور سیاسی دبدبہ کا استعمال کرتا ہے۔

استعمار جدید دور میں:

پندرہویں اور سولہویں صدی میں شروع ہونے والے استعمار کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے، کیوں کہ استعمار کے خلاف مزاحمت کی مقبولیت عوام میں بڑھتی گئی اور ان میں سیاسی و معاشی اور تعلیمی بیداری پیدا ہوگئی۔ لیکن انیسویں صدی میں عالمی جنگ عظیم اول کے دوران استعماری فکر اور پالیسی نے پھر سر اٹھانے شروع کئے۔ اب روس، اٹلی، جرمنی، امریکہ اور جاپان جیسے ممالک نے استعماری روش اپنائی۔ انہوں نے راست طور بھی اور زیادہ تر اقتصادی استحصال کے ذریعہ اپنی استعماری فکر کو فروغ دیا، اور دنیا کے متعدد خطوں کو اپنا غلام بنالیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد 'مجلس اقوام' کی داغ بیل ڈالی گئی تو ایک بہتر عالمی نظام کے قیام کی امید قائم ہوئی، اور استعماری

طاقتوں کو محسوس ہوا کہ یہ ادارہ ان کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ دوسری طرف جاپان نے 1931ء میں چین پر حملہ کر دیا اور اپنی استعماری سلطنت قائم کرنی چاہی۔ یہ حکومتیں جاپان، اٹلی، جرمنی اور سوویت یونین کی سربراہی میں ایک نئے استعماری راہ پر چلنے لگ گئیں اور یوں ایک نیا استعمار شروع ہوگیا۔

یورپی استعمار کا اصل محرک سامراجیت تھا۔ دوسری طرف یوروپ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے آنے والے صنعتی انقلاب کے لئے آزاد تجارت، سرمایہ کی نکاسی، خام تیل کی فراہمی اور مصنوعات کی فروخت کے لئے منڈیوں کی تلاش تھی، اور اس کی مناسب جگہ انھیں براعظم ایشیاء اور افریقہ نظر آئے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے علاوہ بیلجیم، جرمنی، امریکہ اور جاپان نے بھی نوآبادیاں قائم کیں۔

عرب قومیں خلافت سے استعمار کے شکنجہ میں: پہلی عالمی جنگ میں ترکوں کی شکست سے عالم اسلام کو شدید نقصان پہنچا، اس کے نتیجہ میں نہ صرف خلافت کا خاتمہ ہوا، بلکہ عرب علاقے ایک طویل مدت کے لئے برطانیہ اور فرانس کی استعماری طاقتوں کے تسلط میں چلے گئے۔ ترکوں اور عربوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے دشمنی پیدا ہوئی، اور آہستہ آہستہ اسلام بیزاری بھی داخل ہوگئی۔ گوکہ 1913ء تک یوروپ کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے اور سلطنت عثمانیہ کے تحت ترک کے علاوہ عرب علاقے باقی تھے۔ اس دوران کئی عرب رہنماؤں جیسے شریف سنوسی، رشید رضا مصری، اور امیر شکیب ارسلان وغیرہ نے عربوں اور ترکوں کے اتحاد کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی؛ لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ جنگ عظیم کے موقع پر عربوں نے حجاز، شام اور عراق میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی، اس کے نتیجہ میں عرب علاقے بھی سلطنت عثمانیہ سے نکل گئے۔ عربوں نے اس کو اپنی آزادی سمجھی تھی، اور انگریزوں نے انھیں یہی باور بھی کرایا تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ خلافت عثمانیہ سے نکل کر یوروپی ممالک کے استعماری شکنجہ میں چلے گئے۔ اور یہی نہیں بلکہ ترکوں کی اس شکست کے نتیجہ میں فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی دشمنوں کی تحریک کامیاب ہوگئی۔ اناطولیہ کی سرزمین بھی شکست کے اثرات سے نہ بچ سکی جو عثمانی دور میں سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ استنبول میں بھی غیر مسلم فوجیں داخل ہوگئیں، اور حکومت عثمانیہ کو معاہدہ Seures پر مجبور کر کے ترکی کی سرزمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، مشرقی ترکی میں ارمنی اور کرد باشندوں کی حکومتیں بنادی گئیں، اور جنوبی حصے ان کے اور فرانس کے تحت کر دیے گئے۔

شمالی افریقہ کے مسلم ممالک پر استعمار: شمال مغربی افریقی ممالک میں استعمار کا آغاز اس وقت ہوا جب 1830ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا، جو 132 سال تک جاری رہا۔ اسی طرح اس نے 1881ء میں تیونس کو اپنے قبضہ میں لیا، جو 75 سال بعد 1956 میں ختم ہوا۔ مغرب یعنی مراکش کو 1912 میں فرانس نے اپنے قبضہ

میں کیا، اور 44 سال بعد اس کو آزادی مل سکی۔ ان تمام فوجی کارروائیوں کا آغاز اس وقت ہوا جب 1798 میں نپولین بوناپارٹ کی قیادت میں فرانسیسی لشکر نے مصر پر تسلط جمایا، تاکہ فرانسیسی امپائر کو مشرق میں وسع کیا جاسکے۔ اگرچہ کہ مختلف وجوہات کی بنیاد پر، جن میں برطانوی فوجوں سے بحری لڑائی میں فرانسیسی بیڑہ کی شکست اہم ہے، مصر میں فرانسیسی سامراج تین سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ البتہ انہوں نے شمال مغربی افریقہ کے دیگر ملکوں پر برسوں اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ جب فرانس نے تیونس پر قبضہ کیا تو اٹلی نے اس کو اپنی غیرت کا مسئلہ بنایا، اور 1882ء میں جرمنی اور آسٹریا کے فرانسیسی مخالف اتحاد میں وہ شامل ہوگیا۔ اسی کے ساتھ اٹلی کے اندر نوآبادیاتی شہنشاہیت قائم کرنے کا جذبہ بھی پنپ رہا تھا، جس کے تحت اس نے اریٹیریا اور صومالیہ میں اپنی کالونیاں قائم کر لی تھیں۔ 1887ء میں اٹلی نے جرمنی، آسٹیریا، اسپین اور برطانیہ کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ کیا، تاکہ فرانس کو مراکش (مغرب) یا لیبیا پر قبضہ کرنے سے روکا جا سکے، جبکہ خود اٹلی نے لیبیا کی جانب توجہ مرکوز کردی۔

الجزائر پر فرانسیسی تسلط اور آزادی:

شمالی افریقہ کے ممالک میں مصر سے لے کر الجزائر تک پورا علاقہ سولہویں صدی میں عثمانی سلطنت کا حصہ تھا۔ صرف مراکش پر ترکوں کا اقتدار قائم نہ تھا۔ شمالی افریقہ کے ان ملکوں میں سب سے پہلے الجزائر پر مغربی تسلط قائم ہوا۔

1553ء سے 1830ء تک الجزائر پر ترکوں کا قبضہ رہا، الجزائر کے ترک گورنر کہلاتے تھے، جو سترہویں صدی میں رفتہ رفتہ عملاً خودمختار ہوگئے؛ لیکن وہ عثمانی سلطنت کی بالادستی کو تسلیم کرتے تھے۔ اس زمانہ میں تونس، الجزائر اور مراکش کے ساحلی علاقوں میں بحری مہمات کو عروج حاصل ہورہا تھا، جہاں بحری قزاق پھیلے ہوئے تھے۔ خیرالدین باربروسہ مشہور ترک امیرالبحر تھے اور انھوں نے ہی الجزائر کو فتح کرکے اسے عثمانی حکومت کا حصہ بنایا تھا، اس طرح وہ الجزائر کی پہلی حکومت کے بانی سمجھے گئے تھے۔

انیسویں صدی میں جب عثمانی سلطنت کمزور ہوگئی تو فرانس کو الجزائر میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ 1827ء میں فرانس نے مختلف بہانوں سے الجزائر کے خلاف کارروائیاں شروع کردیں، اور 14 جون 1830ء کو اس نے تیرہ ہزار فوج الجزائر کے ساحل پر اُتار دی اور 5 جولائی کو شہر الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ اگلے چند سالوں میں یہ قبضہ پورے ملک پر قائم ہوگیا۔

الجزائر کے رہنماؤں نے فرانس کے تسلط سے بچنے کے لئے بڑی مزاحمت کی، ان میں سب سے نمایاں شخصیت امیر عبدالقادر الجزائری کی ہے، انہوں نے مختلف قبائل کے اختلافات ختم کرکے متحد ہوکر فرانس کے مقابلہ کا منصوبہ بنایا۔ الجزائری مسلمانوں کی قیادت 1832ء میں سنبھالنے کے بعد امیر عبدالقادر نے جلد ہی مغربی الجزائر کے قبائل کو اپنے جھنڈے کے تحت متحد کر لیا، اور فرانسیسی فوجوں کو کئی شکستیں دیں، یہاں تک کہ فروری 1834ء میں فرانس نے امیر عبدالقادر کو مغربی الجزائر کا امیر تسلیم کرلیا؛ لیکن فرانس سے دوبارہ تصادم شروع ہوگیا، اور فرانسیسی فوجوں کی کثرت اور جدید اسلحہ کا مقابلہ نہ کر پانے

کی وجہ سے امیر عبدالقادر الجزائری نے دسمبر 1847ء میں ہتھیار ڈال دئے۔ انہوں نے پندرہ سال تک فرانسیسیوں کا مقابلہ کیا، 1883ء میں ان کا انتقال ہوا، ان کی شکست کے بعد الجزائر میں فرانس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں رہا، اور ایک سال کے اندر اندر پورے الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہوگیا، اور الجزائر کو فرانس کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا، جہاں فرانسیسیوں کو آباد کیا جاسکے۔

گوکہ فرانس نے سو سال تک الجزائر پر اپنے قبضہ کی مدت میں اسے ترقی دینے کی کوشش کی، بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا، سڑکیں اور ریل کی پٹریاں تعمیر کیں، اور شہروں کو جدید طرز پر تعمیر کیا۔ لیکن اس ترقی کا سارا فائدہ فرانسیسیوں کو پہنچایا گیا، اور الجزائر کے مقامی باشندوں کو محروم رکھا گیا۔ چنانچہ اس مدت میں الجزائر کے اندر فرانسیسیوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہوگئی، اور زرخیز زمینوں کا ایک تہائی حصہ ان آبادکاروں کے قبضہ میں چلا گیا، شہروں میں ان کی تعداد مقامی باشندوں سے بھی زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ آزادی کے وقت الجزائر شہر کی 55 فیصد آبادی اصل باشندوں کی تھی اور 60 فیصد آبادی فرانسیسی تھی۔ اس دوران آزادی کی تحریکیں بھی اٹھیں، اور آخر کار 1962ء کو الجزائر فرانسیسی استعمار کے تسلط سے آزاد ہوا۔

تیونس پر استعماری تسلط:

1574ء سے 1881ء تک تیونس پر سلطنت عثمانیہ کا اقتدار قائم رہا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب تیونس اور یوروپ کے درمیان تعلقات عام ہوئے تو ان کے ذریعہ مغربی نظریات تیونس میں پھیلنا شروع ہوگئے۔ تیونس کے حسینی بے خاندان کے حکمرانوں کے دور (1705 سے 1957) میں دسویں حکمراں صادق (1859 تا 18821) کا دور تیونس کے اس خاندان کی تاریخ میں سب سے اہم ہے۔ اس دور میں تیونس کی حکومت نے مختلف تعمیری کاموں کے لئے بیرونی سرمایہ اس کثرت سے حاصل کیا کہ وہ یوروپی ملکوں کا مقروض ہوگیا، اور ان ملکوں کو تیونس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ 1869ء میں تونس کے دیوالیہ ہوجانے پر برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے تیونس کے مالی امور پر کنٹرول قائم کرلیا۔ ان مایوس کن حالات میں خیر الدین پاشاہ کا ظہور ہوا جو اسلامی دنیا کے عظیم رہنماؤں اور مصلحین میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

خیر الدین پاشا (1810 تا 1889) نسلاً ترک تھے۔ صادق کے زمانے میں اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ صادق نے انہیں 1875ء میں وزیر اعظم بنایا، اور وہ 4 سال تک اس عہدے پر فائز رہے، اس دوران انھوں نے کئی تعمیری و اصلاحی کام کئے، اور برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے تسلط سے تیونس کو بچائے رکھا، جس کے لئے انہوں نے کئی کوششیں کیں۔ خیر الدین پاشاہ نے اپنی وزارت کے آخری زمانے میں یوروپی ملکوں، خصوصاً فرانس کے خطرناک عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے سلطنت عثمانیہ سے ضروری تعلق پیدا کرنا چاہا؛ لیکن اس پالیسی نے صادق کے دل کو خیر الدین کے خلاف مشکوک بنادیا، اور ان شکوک کی وجہ سے ان کو 1888ء میں وزارت عظمیٰ کے منصب سے علیحدہ کردیا گیا، پھر وہ ترکی چلے گئے اور وہیں پر استنبول میں 1889ء

میں ان کا انتقال ہوا۔

انیسویں صدی میں خیرالدین پاشا کے ترکی چلے جانے کے بعد تیونس کے حالات اور ابتر ہو گئے، مصر کی طرح تیونس بھی بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، اور ان قرضوں کے بہانے تیونس میں بیرونی مداخلت شروع ہوگئی تھی۔ قرضوں کی ادائیگی کے لئے جب بہت زیادہ ٹیکس لگائے گئے تو ملک میں حکومت کے خلاف بے چینی پیدا ہوگئی اور اس سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے فرانس نے فوجی مداخلت کی اور 12 مئی 1881ء کو تیونس کی حکومت کو معاہدہ پر مجبور کر کے اسے فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دے لیا۔ اس حفاظت کی آڑ میں استعمار نے تیونس میں اپنی جڑیں مضبوط کر دیں، اور فوجی تسلط کے بعد وہاں کے سیاسی، انتظامی اور معاشی ڈھانچے میں اسی قسم کی تبدیلیاں کی گئیں جو مصر میں انگریزوں نے کی تھیں۔ اس سے بلا شبہ مالی اور تنظیمی ڈھانچے میں مثبت تبدیلیاں ہوئیں؛ لیکن وہیں علاقائی باشندوں کا زبردست سیاسی اور معاشی استحصال ہوا، اور اصل فائدہ فرانس نے خود اٹھایا۔

تیونس میں فرانس کی پالیسی مصر میں انگریزوں کی پالیسی سے مختلف تھی، مصر میں انگریز باشندوں کو آباد نہیں کیا گیا تھا؛ لیکن تیونس کو فرانس نے اپنی ایک نوآبادی بنالیا تھا، انہوں نے تمام اچھی اچھی زمینیں خرید لیں اور ملک کی زراعت اور صنعت پر قابض ہو گئے۔ بیسویں صدی کے وسط میں تیونس کے اندر فرانسیسی آبادکاروں کی تعداد وہاں کی اصل آبادی کا دس فیصد ہوگئی تھی، اور شہروں میں ان کی تعداد نصف سے زیادہ ہوگئی تھی۔ 20 مارچ 1956ء کو تیونس کو آزادی نصیب ہوئی، جس میں حبیب بورقیہ کی آزادی کی تحریک کو دخل تھا، چنانچہ بورقیہ اس کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

مصر پر برطانوی استعمار:

1517ء میں مصر عثمانی سلطنت کے زیر اقتدار آیا تھا، لیکن اس کے بعد دیگر عثمانی مقبوضات کی طرح مصر میں بھی زوال شروع ہوگیا۔ مصر کے عثمانی والی عموماً مملوک ترک ہوتے تھے، جنھوں نے مصر کو نیم آزاد رکھا۔ اسی دور میں فرانس نے نپولین بوناپارٹ کی قیادت میں 1798ء میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ترک اور برطانوی فوجوں نے 1801ء میں فرانسیسیوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اس جنگ میں البانوی افسر محمد علی کی نمایاں خدمات کی وجہ سے عثمانی حکومت نے 1805ء میں اسے مصر کا عثمانی والی مقرر کر دیا، یہ عہدہ محمد علی کی اولاد میں موروثی ہوگیا، اور وہ خدیو کہلانے لگے۔

خدیو حکمراں 1805ء سے 1882ء تک مصر کے حکمراں رہے، اس عرصہ میں یہ حکمراں عملاً آزاد تھے؛ لیکن عثمانی خلافت کی بالادستی کو آئینی طور پر تسلیم کرتے تھے، پھر 1882ء میں مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، لیکن تب بھی عثمانی خلافت کی بالادستی برقرار رہی۔ انگریزی قبضہ مصر پر 1992ء تک قائم رہا۔ برطانوی تسلط کے زمانے میں مصر کے انتظامی اور مالی امور پر خاصی توجہ دی گئی، جس سے مصر کو بڑی حد تک فائدہ پہنچا۔

لیبیا پر استعماری قبضہ:

لیبیا وہ ملک ہے جس پر سب سے آخر میں استعمار کا قبضہ

ہوا۔ موجودہ صدی سے پہلے اسلامی تاریخ میں لیبیا نام کا کوئی ملک نہیں تھا، موجودہ لیبیا کا نصف شمال مشرقی حصہ جسے 'برقہ' کہتے ہیں وہ مصر کی حکومت میں شامل ہوتا تھا، اور نصف شمال مغربی حصہ طرابلس کہلاتا تھا، جو بالعموم تیونس کی حکومت کے تحت ہوتا تھا۔ 1551ء میں امیر البحر سنان پاشا کی کوششوں سے طرابلس اور نیفازی کا علاقہ عثمانی سلطنت میں شامل ہوا، پھر تین سال بعد لیبیا کا جنوبی علاقہ بھی جو صحرائے اعظم کا حصہ ہے' عثمانی مقبوضات میں داخل ہوگیا، اس طرح وہ ملک وجود میں آیا جو اب لیبیا کے نام سے جانا جاتا ہے؛ عثمانی سلطنت میں یہ علاقہ طرابلس کے نام ہی سے معروف رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں فرانس نے مغربی افریقہ پر قبضہ کی کوشش کی ۔ لیبیا میں موجود سنوسی تحریک کے رہنماؤں نے جب ان کا مقابلہ کیا تو فرانس نے 1902ء میں فوجی کارروائی شروع کردی، سید احمد شریف سنوسی دس سال تک فرانس کا مقابلہ کرتے رہے۔ فرانس سے جنگ ابھی جاری تھی کہ شمال کی سمت سے اٹلی بھی لیبیا پر حملہ آور ہوگیا۔ اب سنوسی تحریک کو دونوں قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ لیبیا کے جنوبی صحرائی علاقے میں سنوسی تحریک کا آغاز ہوا تھا، جس کے بانی سید محمد بن علی سنوسی (م: 1859ء) تھے۔ ان کے صاحبزادے سید مہدی (م:1902ء) کے زمانے میں سنوسی تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ پھر ان کے انتقال کے وقت ان کے صاحبزادے سید محمد ادریس کی عمر چونکہ صرف بارہ سال تھی، اس لئے تحریک کی قیادت ان کے چچازاد بھائی سید احمد شریف (م1933ء) کے ہاتھ میں آئی تھی۔

اٹلی نے 5 اکتوبر 1911ء کو طرابلس پر قبضہ کرلیا، لیبیا کے باشندوں نے قدم قدم پر اٹلی کا مقابلہ کیا۔ 1917ء سے 1918ء تک اٹلی کے ساتھ جنگ جاری رہی۔ بعد میں اس تحریک کو برطانیہ سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ آخر میں محمد ادریس سنوسی کی قیادت میں اٹلی سے صلح کے مذاکرات شروع ہوئے جو ناکام رہے۔ اور 1922ء میں محمد ادریس بھی مصر چلے گئے۔ پھر سدی عمر مختار نے مقابلہ کی شاندار تاریخ رقم کی۔ 1933ء میں عمر مختار کے خاتمے کے ساتھ ساتھ سنوسی تحریک کی مسلح مزاحمت ختم ہوگئی، اور لیبیا پر اٹلی کا استعمار قائم ہوگیا۔ دیگر استعماری طاقتوں کی طرح اٹلی نے بھی اپنی نوآبادی لیبیا میں معاشی اور اقتصادی نوعیت کے کئی اہم کام انجام دیے، لیکن ان تمام معاشی اور تمدنی ترقیوں سے اہل لیبیا کو خاص فائدہ نہیں پہنچا، اٹلی نے لیبیا کو ایک اطالوی ملک بنا دینا چاہا، اور اس کے لئے لاکھوں کی تعداد میں اطالوی لیبیا میں آباد کئے گئے، اور یہ سلسلہ دوسری جنگ عظیم تک جاری رہا۔ اس دوران مقامی باشندوں سے اچھی اور ساحل کی بہترین زمینیں چھین کر ان کو دے دی گئیں اور مقامی باشندوں کے لئے صحراء اعظم کا علاقہ چھوڑ دیا گیا۔ 1943ء میں دوسری جنگ عظیم کے اندر جرمنی کی شکست کے بعد لیبیا پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہوگیا، اور 24 دسمبر 1951ء کو لیبیا کو ایک آزاد مملکت قرار دے دیا گیا۔

استعمار کے محرکات:

سیاسی غلبہ: مغربی استعمار مسلم ممالک کے اندر پہلے تاجر اور مبلغ کی حیثیت داخل ہوا، لیکن جلد ہی اس نے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر یلغار کر دی ، اور وہاں اپنی حکومتیں قائم کر کے

مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے سائے میں اور مغربی فوجوں کے تحفظ میں زندگی گزار کے پر مجبور کر دیا۔ مغربی استعمار نے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچایا۔ آج بھی مغرب سب سے بڑی ظالم قوت کا رول دنیا کے اندر ادا کر رہا ہے۔

معاشی استحصال: استعماری طاقتوں کا ایک اہم مقصد نوآبادیوں کے عوام اور وسائل کا معاشی استحصال رہا ہے، مغرب نے پورے مشرق خصوصاً مسلم ممالک کا معاشی استحصال کیا جس کی تفصیل الجزائر، تیونس، لیبیا اور مصر کے تذکرہ میں پیچھے گزر چکی ہے، یہ مغرب کی سوچی سمجھی پالیسی تھی کہ ان ممالک میں مسلمانوں کو اقتصادی اور سماجی طور پر کمزور کر دیا جائے۔

تہذیبی وثقافتی غلبہ: استعمار نے مفتوحہ ممالک میں مقامی آبادی کو ذہنی، اخلاقی، تہذیبی اور علمی اعتبار سے پسماندہ اور محتاج رکھنے کی بھرپور کوشش کی، اور اس کے لئے اپنے تمام وسائل صرف کر دئے کہ عوام اپنی تہذیبی جڑوں سے کٹ کر مغربی ثقافت کو اختیار کر لیں۔

مغربی نظام تعلیم کی ترویج: مغرب نے اپنی نوآبادیوں میں ایسا نظام تعلیم رائج کیا جو ان کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کر سکے، اور وہاں کی عوام ذہنی طور استعماری طاقتوں سے مرعوبیت کی زندگی گذاریں اور ان کی نقل پر فخر محسوس کریں۔

عیسائیت کا فروغ: استعماری طاقتوں نے ان ممالک کے اندر عیسائی مشنریوں کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کریں، اور اس کے لئے انھوں نے تعلیمی اداروں اور فلاحی منصوبوں کے ساتھ مذہبی مناظروں کا بازار بھی گرم کیا، اور لوگوں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

فتنۂ استشراق: مغرب کی استعماری طاقتوں نے علمی وفکری محاذوں پر بھی مورچہ بندی کی، چنانچہ اسلامیات کے میدان میں استشراق کا ظہور ہوا۔ مستشرقین نے اسلامی تہذیب اور علوم اسلامی کے تئیں تعصب اور عناد کا رویہ اختیار کیا۔

خاتمہ:

غور کیا جائے تو استعمار کی روح کوئی نئی چیز نہیں تھی، اسلامی تاریخ میں اس کی مختلف مثالیں اور نمونے ملتے رہے ہیں۔ موجودہ دور کا استعمار اسی تصور کا تسلسل تھا۔ اسلام کسی بھی قسم کے استحصالی تصور سے دور ہے۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ دولت اللہ کی ہے، انسان اس میں امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے دولت کسی ایک جگہ مرتکز نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ اسے پوری سوسائٹی میں گردش میں رہنا چاہئے۔ مال کا بہاؤ خوشحال افراد سے بدحال افراد کی طرف ہونا چاہئے۔ ترقی کا اسلامی تصور سرمایہ دارانہ استعمار اور معاشی، تہذیبی اور ثقافتی تسلط والے استعمار سے یکسر مختلف ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر متوازن، غیر استحصالی، انسان دوست، ماحول کے لئے مناسب اور معاشرہ کے سلسلہ میں ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ اسلام پسندوں کو تاریخ کے خاتمے End of History کے طرز یہ پر ضرور سوال اُٹھانا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ مغرب کی تہذیب سب سے اعلیٰ تہذیب نہیں ہے؛ بلکہ یہ شاخ نازک پر بنا ہوا وہ آشیانہ ہے جو ناپائیدار ثابت ہوگا، جس کے لئے نظریاتی سطح پر مقابلہ کے ساتھ ساتھ عوامی جدوجہد بھی ضروری ہوگی۔

☆☆☆

❑ مطالعات

معارف الحدیث میں دعوتی پہلو

محمد شہاب علوی
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات سنی اے۔ایم۔یو

مولانا منظور نعمانیؒ کا شمار ہندوستان کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا ہے۔آپ شریعت کے پاسبان ،نامور مصنف وادیب، مناظر اسلام اور رابطہ عالم اسلامی کے رکن تھے۔آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں جوکہ بہت مشہور ہیں۔اس میں خاص طور سے معارف الحدیث کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

معارف الحدیث احادیث کا نیا اور نرالا انتخاب ہے۔متون احادیث اصل عربی میں ہیں ،ترجمہ اردو میں ہے ۔اس میں زیادہ تر احادیث وہ ہیں جو عام زندگی اور اس کے حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔اس وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر اس کے گہرے اثرات ہیں۔اس کے علاوہ یہ غیر مستند روایات سے بھی محفوظ ہے۔

کتاب کا اصل مقصد چونکہ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین اور آپ کے بیان کردہ دینی حقائق سے قریب کرنا اور ان کے دل ودماغ میں ان حقائق پر یقین اور اطمینان پیدا کرانے کی کوشش کرنے کے علاوہ ان کو آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی ترغیب دینا بھی ہے۔اس لئے اس کتاب میں جگہ جگہ دعوتی پہلو بھی ملتا ہے۔اسی وجہ سے مولانا نعمانیؒ معارف الحدیث کے دیباچہ میں آخری گزارش کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''آخری گزارش اپنے باتوفیق ناظرین سے یہ ہے کہ حدیث کا مطالعہ خالص ''علمی سیر'' کے لئے ہرگز نہ کیا جائے۔نیز مطالعہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کی عظمت ومحبت کو دل میں ضرور بیدار کیا جائے اور اس طرح ادب وتوجہ سے پڑھا جائے یا سنا جائے کہ گویا حضور ﷺ کی مجلس اقدس میں حاضر ہیں اور آپ فرمارہے ہیں ہم سن رہے ہیں۔اگر ایسا کیا گیا تو اس کے انوار وبرکات انشاء اللہ نقد نصیب ہونگے''۔(معارف الحدیث جلد اول، دیباچہ،ص۱۴)۔

میں آپ کے سامنے معارف الحدیث سے کچھ مثالیں عرض کروں گا جس سے آپ کو پتہ چلے گا کہ کس طرح سے اس کتاب میں ہمارے لئے دعوتی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔مثلاً ہمسایوں اور پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ایسے ارشادات جن میں انکی حق تلفی کرنے والوں کو آپ ﷺ نے بار بار قسم کھا کر فرمایا کہ وہ مؤمن نہیں ہیں۔

مولانا نعمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''افسوس یہ کہ اس طرح کی حدیثیں ہمارے علمی اور درسی حلقوں میں اب کلامی بحثوں اور علمی موشگافیوں کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں،شاذ ونادر ہی اللہ کے وہ خوش نصیب بندے ہونگے جو یہ حدیثیں پڑھ کر اور سن کر زندگی کے اس شعبے کو درست کرنے کی فکر میں لگ جائیں،حالانکہ حضور ﷺ کے ان ارشادات کا مقصد ومدعا یہی ہے۔یہ حدیثیں پڑھنے اور سننے کے بعد بھی

پڑوسیوں کے ساتھ برتاؤ اور رویہ کو بہتر اور خوشگوار بنانے کی فکر نہ کرنا بلاشبہ بڑی شقاوت اور بدبختی کی نشانی ہے''۔(معارف الحدیث، حصہ ششم، ص ۳۰۸)۔

اسی طرح ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''افسوس کہ عہد نبوی ﷺ سے جتنا بعد ہوتا گیا امت آپ ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات سے اسی قدر دور ہوتی چلی گئی۔رسول اللہ ﷺ نے پڑوسیوں کے بارے میں جو وصیت اور تاکید امت کو فرمائی تھی اگر صحابۂ کرامؓ کے بعد بھی اس پر امت کا عمل رہا ہوتا تو یقیناً آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو توفیق دے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم وہدایت کی قدر و قیمت سمجھیں اور اس کو اپنا دستور العمل بنائیں''۔(معارف الحدیث حصہ ششم، ص ۳۱۱)

اسی طرح کتاب الزکوٰۃ کے سلسلے میں بعض وہ روایات ذکر کر کے جن میں حتی الوسع سوالات سے منع فرمایا گیا ہے۔

مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

''افسوس! جس پیغمبر کی یہ ہدایت اور یہ طرز عمل تھا، اس کی امت میں پیشہ ور سائلوں اور گداگروں کا ایک طبقہ موجود ہے اور کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو عالم یا پیر بن کر معزز قسم کی گداگری کرتے ہیں۔یہ لوگ سوال اور گداگری کے علاوہ فریب دہی اور دین فروشی کے بھی مجرم ہیں''۔(معارف الحدیث حصہ چہارم، ص ۳۲۴، کتاب الزکوٰۃ)

اسی طرح یہ حدیث شریف کہ ''آدمی کے اسلام کی خوبی اور اسکے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں سے بچے'' ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''انسان اشرف المخلوقات ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت قیمتی بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کو اس وقت کا اور صلاحیتوں کا جو سرمایا دیا گیا ہے، وہ اس کو بالکل ضائع نہ کرے، بلکہ صحیح طور سے اس کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ ترقی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرے۔جو لوگ غفلت سے لایعنی باتوں اور بے حاصل چیزوں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کرتے ہیں، وہ نادان جانتے نہیں کہ اللہ نے ان کو کتنا قیمتی بنایا ہے، اور وہ اپنے کیسے بیش بہا خزانہ کو مٹی میں ملاتے ہیں، اس حقیقت کو جنہوں نے سمجھ لیا ہے، بس وہی دانا اور عارف ہیں''۔(معارف الحدیث جلد اول، ص ۹۹، کتاب الایمان)۔

مولانا نعمانیؒ نماز کی اہمیت سے متعلق حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''افسوس کیسی بدبختی ہے کہ نماز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ان ترہیبی اور ترغیبی ارشادات کے باوجود امت کی بڑی تعداد آج نماز سے غافل اور بے پرواہ ہو کر اپنے کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے الطاف وعنایات سے محروم اور اپنی دنیا وآخرت کو برباد کر رہی ہے''۔(معارف الحدیث، حصہ سوم، ص ۸۳، کتاب الصلوٰۃ)

مولانا نعمانیؒ نماز میں صف بندی کی اہمیت کے تعلق سے احادیث ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یعنی تمہاری وحدت اور اجتماعیت پارہ پارہ کر دی جائے گی اور تم میں پھوٹ پڑ جائے گی، جو امتوں اور قوموں کے لئے اس دنیا میں سو عذابوں کا ایک عذاب ہے۔صفوں کو برابر اور سیدھا کرنے میں کوتاہی اور غفلت پر باہمی اختلاف اور پھوٹ کی وعید متعدد حدیثوں میں وارد ہوئی ہے اور بلاشبہ اس قصور اور اس کی سزا میں خاص مناسبت ہے۔افسوس بہت سی دوسری چیزوں کی طرح اس معاملہ میں بھی کوتاہی خاص کر بعض علاقوں میں بہت عام ہو چکی ہے''۔(معارف الحدیث، حصہ سوم، ص ۱۳۳، کتاب الصلوٰۃ)۔

سطور بالا سے یہ مفہوم مستنبط ہوتا ہے کہ معارف الحدیث مولانا منظور نعمانیؒ کی ایک اہم ترین تصنیف ہے،اس کتاب میں جہاں زندگی کے دینی شعبوں پر رہنمائی ملتی ہے وہیں اس بات کا احساس بھی ابھرتا ہے کہ اس میں سماجی ، معاشی اوراقتصادی مسائل کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی مختلف مدارس وجامعات میں اس کی تدریس ہوتی ہے۔مثلاً ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ علاوہ ازیں بیرون ممالک کے مسلم افراد بھی اس کے فیض سے محروم نہیں ہیں بلکہ انگلینڈ اوردیگر ممالک میں اس کتاب کی تعلیم مساجد میں ہوتی ہے اوراسی کے ساتھ ساتھ دینی حمیت سے حامل اشخاص بھی اپنے گھروں میں تعلیم کرتے ہیں۔چنانچہ علم حدیث پر مولانا نعمانیؒ کا یہ وقیع ذخیرہ تمام امت مسلمہ کے لئے یہ سبق دیتا ہے کہ امت کا رشتہ اسوۂ نبوی ﷺ اور حدیث نبوی سے مضبوط ومستحکم ہو۔جب تک ہم علوم نبوت کو اپنی زندگی کا نصب العین نہیں بنائیں گے۔اس وقت تک ہم علوم نبوت کے صحیح وارث نہیں ہوسکتے۔حدیث سے ہمارا لگاؤ جہاں جذباتی ہو وہیں علمی وتحقیقی ہونا چاہئے اورزندہ قوموں کے لئے تحقیقی مزاج پیدا کرنا ہی عظمت رفتہ کی بازیابی کی علامت ہے۔

☆☆☆

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی خصوصیات

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

''آپ کی دعوت کا راز دروں یہ ہے کہ اس کے اندر آفاقیت،ابدیت،اور جامعیت پائی جاتی ہے،وہ رنگ ونسل اور ذات پات کی تنگ نائیوں میں محدود نہیں ہے،اس کا پیغام آفاقی اورسب کے لئے ہے اوروہ پوری انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرتی ہے،ایک طرف وہ اگر ذکر وعبادت کے طریقے سکھاتی ہے،تو دوسری طرف دیگر ادیان ومذاہب کی تمام انسانی خوبیوں اورشرافتوں کے معیار کو اپنے دامن میں سمیٹنا نہیں بھولتی،وہ انبیاء کے درمیان تفریق وامتیاز کی قائل نہیں،بلکہ سب کا یکساں احترام کرنا سکھاتی ہے،وہ نسل انسانی کے لئے ایک متحدہ مرکز اورایک پلیٹ فارم رکھتی ہے،اوراس کو ایک ایسی جمعیت میں تبدیل کرنا چاہتی ہے، جو متحد ہو اور یکساں مقاصد کی حامل ہو۔پوری کائنات میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دین ودنیا کے درمیان فرق وامتیاز نہیں کرتا، بلکہ حسب ضرورت جائز حدود میں رہتے ہوئے دونوں سے فائدہ اٹھانے اور دونوں کے حقوق ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے،وہ "ما لقیصر لقیصر وما لله لله" کے فلسفۂ حیات کو قبول نہیں کرتا۔

اسلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے، زندگی کا کوئی گوشہ اسلامی تعلیمات سے محروم نہیں،عبادت ہو، سیاست ہو،معاشیات ہو،اخلاقیات ہو،نباتات ہو، جمادات ہو،تعلیم وتعلم کا میدان ہو،غرضیکہ اسلام میں ہر ایک کے لئے رہنمائی موجود ہے، کیوں کہ اسلام ابدی، جامع اور ہمہ گیر متوازن نظام حیات ہے اور یہی جامعیت اس کی کشش کا سبب ہے اوراسی جامعیت کی وجہ سے وہ اس وقت بھی سب سے زیادہ پھیلنے والا دین ہے اوراس کی یہ مقبولیت ہی اس کے مخالفین کے لئے پریشانی اوردشمنی کا سبب ہے۔ (محسن انسانیت،مؤلفہ:مولانا واضح رشید حسنی ندوی،ص۷۰)